اقبال اور عشقِ رسولؐ

پروفیسر سیّد محمد عبدالرشید

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۴۹۱، گلی کوتانہ سوئیوالان نئی دہلی

اقبال اور عشقِ رسولؐ

پروفیسر سیّد محمد عبد الرشید

بارِ دوم

سنِ طباعت ۱۹۸۳ء

کتابت ..... قطب الدین احمد شیر کوٹی

تصحیح بہار اللہ آبادی .....

زیرِ نگرانی ..... اعتقاد حسین صدیقی

طباعت ..... کلر نٹنگ پریس دہلی ۶

قیمت ..... بیس روپیہ -/۲۰

باہر سے آنے والے حضرات اس پتہ پر ملیں

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۵۱۱ گلی مٹیا محل دہلی ۶

اقبال اور عشقِ رسولؐ

مصنّف

پروفیسر سیّد محمد عبد الرّشید

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۴۹۱ گلی کوتانہ سوئیوالان

دھلی ۱۱۰۰۰۲

اِنتساب

میں اپنی ناچیز کوشش "اقبال اور عشقِ رسولؐ" کو
عاشقانِ رسالت مآبؐ کے نام پر معنون کرتا ہوں کہ میرے
نزدیک اُن سے زیادہ مبارک و محترم اور کوئی نہیں۔
معمولی صاحبانِ ثروت و منصب کا تو ذکر ہی کیا،
شاہانِ عالم بھی ان کی قدر و منزلت پر رشک کرتے ہیں۔
اور کیوں نہ کریں ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

ہیچمدان

پروفیسر سید محمد عبدالرشید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی کے عشق کی داستان لکھ دینا آسان ہے۔ کیوں کر عشق ہوا، عشق کے
دن کیا کیا دیکھنا نصیب ہوا مثلاً حسن و جمال اور ناز و ادا کا دیکھنا تھا کہ دل
سے جاتا رہا، کسی بات کا ہوش نہیں اٹھتے بیٹھتے دوست کا خیال ہے
دوست کی یاد۔ جنون کی نوبت آئی تو کپڑے پھاڑ لئے۔ گھر اور آبادی کو
چھوڑ کر جنگل بیابان کو نکل گئے اور بادیہ پیمائی شروع کر دی، پیروں میں
چھالے پڑ جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے قاقم و سنجاب پر چل رہے ہیں۔ تپتی ہوئی
ریت گلاب کے پھولوں کا فرش معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بیشمار باتیں جو
پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں، بیان کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیا آج تک کوئی شاعر
حکیم نکتہ داں عشق کی تعریف کا بھی حق ادا کر سکا ہے؟ کیا عشق کی کیفیات
واردات کے ناپنے کا پیمانہ ہمارے پاس موجود ہے؟

عاشق کے دل پر دوست کی جدائی میں کیا گذرتی ہے، رشک
ماقیامت ڈھاتا ہے۔ دوست کی اداؤں کا دل پر کیسا اثر ہوتا

ہے، پھر جس پر دل آیا ہے اس کے مقابلے میں دنیا جہان کے دوسرے حسینوں کی اداؤں اور اُن کے حُسن جمال کا دل پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ ایک شخص پکار رہا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

دیکھنے والا اس کے جسم کی حرکت، اس کے چہرے کا رنگ دیکھتا اور اس کی آواز سُنتا ہے، مگر کیا اس جذبۂ دل اور کیفیتِ قلبی کو بھی دیکھ سکتا ہے جس سے یہ شعر زبان پر آیا ہے؟ اور یہ تو عام عشق و محبت کی باتیں ہیں۔ ذرا اس شخص کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جو "عشقِ رسولؐ" پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ جہاں عشق کی تعریف بھی بدل جاتی ہے اور نوعیت بھی۔ کیفیات و واردات کی اثر انگیزی بھی اور اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی بدل جاتے ہیں۔

عشقِ رسولؐ سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے! خدا کی معرفت بلکہ ... خوشنودیٔ خدا بھی اسی پر موقوف ہے۔ اسی سے ثابت ہوا کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی عشقِ رسولؐ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ایسی عظیم الشان چیز کا بیان آسان ہے! پھر اس کے ساتھ یہ دکھلانا کہ اقبالؔ کے نزدیک عشقِ رسولؐ سے کیا مراد ہے اور وہ خود ایک بلند پایہ فلسفی ہوتے ہوئے اکثر فلاسفہ کی طرح مائل بہ تشکیک و الحاد ہونے کی بجائے ایسے گرویدۂ اسلام اور عاشقِ رسولؐ کیسے ہوئے کہ اپنے تمام تفلسف اور عقلیت کو ایک متاعِ حقیر کی طرح حضور سرورِ کائناتؐ کے قدموں پر لا ڈالا! وہ کیا اسباب تھے جو اس قلبِ ماہیت کا باعث ہوئے۔ اُس کے لئے اقبالؔ کی پوری زندگی جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کی طفلی، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول کا اثر، کن شخصیتوں سے اثر قبول کیا، مطالعے کی نوعیت اور خود اُن کے ذاتی مشاہدات، غرض کہ پوری سوانح حیات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان کی تصانیف ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کرنے

یہ معلوم کرنا ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ کی کن صفات نے اُن کا دل موہ لیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آگ ان کے سینے میں کب لگی، کس طرح تیز ہوتی گئی اور کب اس حد کو پہنچی کہ جب انھوں نے اپنے تمام فلسفے کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا ؎

مرا درسِ حکیماں در دِ سر داد　　کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

عاشقانِ رسولؐ نے طرح طرح سے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اور حضورؐ کی جناب میں بہتر سے بہتر اسلوبِ بیان اور اچھے سے اچھے الفاظ کے ذریعے ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسّان بن ثابتؓ اور کعبؓ بن زہیر سے لیکر حکیم سنائیؒ، مولانا رومؒ، خاقانی، جامیؒ، عرفی، شہیدیؒ، غلام امام شہیدؒ، محسن کاکوری اور غالب تک سبھی نے بقدرِ ہمت اس فضائے بیکراں میں اپنے طائرِ فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر ایک کو اس کام کی نزاکت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اگرچہ محبت کی باتیں عقل و خرد کی باتوں سے مختلف ہوتی ہیں مگر ع :-

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار!

بھی کسی عاشقِ رسولؐ ہی کی زبان سے نکلا ہے۔ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی تعریف کو پسند فرمایا ہے جو واقعیت پر مبنی ہو۔ یہاں تک کہ حضرت کعبؓ کے قلم سے حضورؐ کی شان میں "سیفٌ مِنْ سُیُوفِ الْھِنْدِ" نکل گیا۔ تو رحمت اللعالمین نے اس کی بھی اصلاح فرما دی کہ سیفٌ مِن سیوف اللہ کہنا چاہئے۔ اسی نزاکت کے پیشِ نظر عرفی نے کہا تھا کہ ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است　　آہستہ رہ کہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن　　نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اور غالب کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

ہے، پھر جس پر دل آیا ہے اس کے مقابلے میں دنیا جہان کے دوسرے حسینوں کی اداؤں اور اُن کے حُسن جمال کا دل پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ ایک شخص پکار رہا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

دیکھنے والا اس کے جسم کی حرکت، اس کے چہرے کا رنگ دیکھتا اور اس کی آواز سُنتا ہے، مگر کیا اس جذبۂ دل اور کیفیتِ قلبی کو بھی دیکھ سکتا ہے جس سے یہ شعر زبان پر آیا ہے؟ اور یہ تو عام عشق و محبت کی باتیں ہیں۔ ذرا اس شخص کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جو "عشقِ رسولؐ" پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ جہاں عشق کی تعریف بھی بدل جاتی ہے اور نوعیت بھی۔ کیفیات و واردات کی اثر انگیزی بھی اور اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی بدل جاتے ہیں۔

عشقِ رسولؐ سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے! خدا کی معرفت بلکہ... خوشنودیٔ خدا بھی اسی پر موقوف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی عشقِ رسولؐ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ایسی عظیم الشان چیز کا بیان آسان ہے! پھر اس کے ساتھ یہ دکھلانا کہ اقبالؔ کے نزدیک عشقِ رسولؐ سے کیا مراد ہے اور وہ خود ایک بلند پایہ فلسفی ہوتے ہوئے اکثر فلا کی طرح مائل بہ تشکیک و الحاد ہونے کی بجائے ایسے گرویدۂ اسلام اور عاشقِ رسولؐ کیسے ہوئے کہ اپنے تمام تفلسف اور عقلیت کو ایک متاعِ حقیر کی طرح حضور سرورِ کائناتؐ کے قدموں پر لا ڈالا! وہ کیا اسباب تھے جو اس قلبِ ماہیت کا باعث ہوئے۔ اُس کے لئے اقبالؔ کی پوری زندگی جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کی طفلی، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول اثر، کن شخصیتوں سے اثر قبول کیا، مطالعے کی نوعیت اور خو۔ اُن کے ذا مشاہدات، غرض کہ پوری سوانح حیات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان تصانیف ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کر

یہ معلوم کرنا ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ کی کن صفات نے اُن کا دل موہ لیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آگ ان کے سینے میں کب لگی، کس طرح تیز ہوتی گئی اور کب اس حد کو پہنچی کہ جب انھوں نے اپنے تمام فلسفے کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا ؎

مرا درسِ حکیماں در دِ سر داد　　کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

عاشقانِ رسولؐ نے طرح طرح سے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اور حضورؐ کی جناب میں بہتر سے بہتر اسلوب بیان اور اچھے سے اچھے الفاظ کے ذریعے ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسّان بن ثابتؓ اور کعبؓ بن زُہیر سے لیکر حکیم سنائیؒ، مولانا رومؒ، خاقانیؒ، جامیؒ، عرفیؒ، شہیدیؒ، غلام امام شہیدؒ، محسن کاکوری اور غالب تک سبھی نے بقدرِ ہمت اس فضائے بیکراں میں اپنے طائرِ فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر ایک کو اس کام کی نزاکت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اگرچہ محبت کی باتیں عقل و خرد کی باتوں سے مختلف ہوتی ہیں مگر ع :-

با خدا دیوانہ باش و محمدؐ ہوشیار!

بھی کسی عاشقِ رسولؐ ہی کی زبان سے نکلا ہے۔ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی تعریف کو پسند فرمایا ہے جو واقعیت پر مبنی ہو — یہاں تک کہ حضرت کعبؓ کے قلم سے حضورؐ کی شان میں "سیفٌ مِن سُیُوفِ الھند" نکل گیا۔ تو رحمۃ اللعالمین نے اس کی بھی اصلاح فرما دی کہ سیفٌ مِن سیوفِ اللہ کہنا چاہئے۔ اسی نزاکت کے پیشِ نظر عرفیؔ نے کہا تھا کہ ؎

عرفیؔ مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است　　آہستہ رہ کہ بر دمِ تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن　　نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اور غالبؔ کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اس لئے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اقبالؔ اس مرحلۂ دشوار سے گذرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر عشق نہ بوالہوسی کا نام ہے اور نہ یہ خلل دماغ اور فتورِ عقل ہے۔ بلکہ ایک وجدانی کیفیت، روحانی مسرت اور کسی بلند مقصد کے لئے عقل و حواس اور شعور کی تمام قوتوں کے ساتھ بے چینی اور والہانہ تڑپ اور اس کے حصول کے لئے ہمہ تن وقف ہوجانے کا نام عشق ہے۔ اقبالؔ کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ رسولِ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ساری دنیا کے لئے شمعِ ہدایت کو وسیلۂ کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس کے لے اس زیادہ سے زیادہ اشاعت چاہتے ہیں۔ اور ساری دنیا کو اُس سے واقف کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ حضورؐ کی جن صفات کو وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح و کامرانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، اُن صفات سے خود ان کا تاثر کس نوعیت کا ہے۔ اور انھوں نے اپنے تاثرات کو کن الفاظ اور کیسے اسالیب کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فارسی اور اُردو کے دوسرے نعت گو شعرا اور اقبالؔ کے اندازِ بیان میں کیا فرق ہے۔ غرضکہ اس قدر گوناگوں... دشواریاں تھیں مگر اس موضوع پر لکھنا افادی حیثیت سے ضروری بھی تھا اس لئے باوجود ان تمام دشواریوں کو میں نے اپنا خیال ترک نہیں کیا۔ اور اپنی امکانی کوشش سے کام لے کر اقبالؔ کے "عشقِ رسولؐ" کا ایک مرقع، نہیں ایک تصویر بہ تصویر بھی نہیں کہہ سکتا بلکہ نمونۂ خیال کہہ تیار کیا ہے۔ جس کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

عشقِ رسولؐ کی ابتدا خدا سے ہوئی۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ اور لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کے اقرار کا حکم اور خدا اور اس کے فرشتوں کا حضورؐ پر درود و سلام بھیجنا اس پر گواہ ہے۔ نیز قرآن پڑھیئے تو اوّل سے آخر تک ذکرِ رسولؐ کے ترانوں سے معمور ہے۔ کہیں حضورؐ کے اخلاق کی تعریف کی جاتی ہے، کہیں آپؐ کی جان کی قسم کھائی جاتی ہے، کہیں آپؐ کی حفاظت کا

دمہ سا جاتا ہے، کہیں آپؐ کے علوِ مرتبت کو بیان کیا جاتا ہے، کہیں دلجوئی و دلداری کی جاتی ہے، کہیں اپنی صفات سے آپ کو متصف کیا جاتا ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ کے رو سے یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا عاشقِ رسولؐ ہے اور یہی نہیں کہ عاشقِ رسولؐ ہے بلکہ رسولؐ کے چاہنے والوں کا بھی عاشق ہے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ۔ اس پر شاہد ہے۔ ملائکہ بھی عاشقِ رسولؐ ہیں۔ حضورؐ پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جو فرشتے ایک دفعہ حضورؐ کے روضۂ انور پر حاضر ہو لیتے ہیں وہ تمام عمر دوبارہ حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ غالبؔ نے ذیل کی عبارت میں غالباً اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"حاملانِ عرش را آمد ہے کہ در عالمِ فرضِ محال نیز نشانش نیست، اگر ہست جز رشکِ طالع جبیں سایان سنگِ آستانش نیست[۱]"

صحابۂ اکرام کے عشق کا تو کہنا ہی کیا! اگر کسی ایک صحابی کے عشق کا حال بیان کرنا چاہیں تو ایک دفتر چاہیئے۔ اسی طرح قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک عاشقانِ رسولؐ برابر ہوتے رہے ہیں۔ اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ بلکہ مسلمان نے تو ہمیشہ اسی چیز کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا۔ ایسا سرمایہ کہ جانِ عزیز کے عوض بھی ہاتھ آئے تو ارزاں ہے۔ اور آج بھی جبکہ مسلمان اخلاقی و دینی اعتبار سے پستی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے اپنے آقا و مولا (فداہ امی و ابی) کا ویسا ہی دیوانہ ہے۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ظاہر کیا ہے۔

نقد کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟ بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
حق کو عشق آشفتہ سری کو چھوڑا؟ رحمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

---

[۱] دیباچہ مہر نیمروز۔

اور جب کہ ایک طرف خدا فرماتا ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اور دوسری طرف خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ تو اللہ نے حسن زیادہ بصیرت کسی کو دی ہے وہ اتنا ہی زیادہ حضورؐ سے محبت کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن یہاں تک فرماتے ہیں کہ ؎

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

عشق کسی کے جمال و مکاں یا جود و نوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا براہِ راست اس سے متمتع ہونے سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ؏

(بسا کیں دولت از گفتار خیزد)

مبارک تھے وہ لوگ جنہوں نے اس پیکرِ حسن و جمال اور سراپا جود و کمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے انوار سے آنکھیں روشن کیں اور اس کے فیوض و برکات سے دامنِ جاں بھر لیا۔ مگر وہ لوگ بھی کم خوش نصیب نہیں تھے جو اس کی تعریف سنکر اس کے شیدا ہو گئے۔ آخر اویس قرنیؓ نے حضورؐ کو کب دیکھا تھا اور کیا اُس ہستی کو نادیدہ کہہ بھی سکتے ہیں جس کے محامد و فضائل انسان تو انسان خود اللہ بیان کرتا ہے، قرآن کا حرف حرف جس کی صورت و سیرت کا آئینہ دار ہے جس کے انوار سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ جگمگا رہا ہے۔ کیا آفتاب بادل کی نقاب چہرے پر ڈال لینے سے غائب ہو جاتا ہے اور دنیائے نور اس کی موجودگی کا پتہ نہیں دیتی؟ پھر وہ آفتاب کیونکر غائب ہو گیا جس کے انوار سے آج بھی دنیا منور ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو دنیا میں اگر کہیں اجالا ہے تو اسی کے جمالِ جہاں آرا کا ہے ورنہ سائنس اور تہذیبِ جدید کی روشنی نے اندھیروں کے پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

حضورؐ کے سیرت نگاروں نے صحابۂ کرامؓ کے بیانات سے ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ جسمانی حسن و جمال بھی اس مقام پر تھے جہاں آج تک کوئی نہ پہنچا۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں ما رأیت احسن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم کأن الشمس تجری فی وجہہ! میں نے حضورؐ سے زیادہ حسین کوئی نہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ کے چہرے میں آفتاب گردش کر رہا ہے یا جیسا حضرت حسانؓ فرماتے ہیں ؎

خلقت مبرأ من کل عیب　　کأنک قد خلقت کما تشاء

آپؐ تمام عیبوں سے پاک کئے گئے ہیں۔ گویا آپ جس طرح چاہتے تھے اُسی طرح تخلیق کئے گئے۔

واحسن منک لم تر قط عینی　　اجمل منک لم تلد النساء

آپ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کہیں نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت فرزند کسی عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔

حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں[1] یہ بیانات بالکل صحیح بلکہ جو وہ سو برس میں جس قدر حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف آپ کے عاشقوں نے کی ہے وہ سب درست مگر ان شواہد کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے جب کہ خدا حضورؐ کو سراجاً منیراً کے لقب سے یاد فرماتا ہے اور ؎

والیل اذا رتے زہولش　　والشمس عیار تے زردلش

اور اگر انسانی شہادت ہی کی ضرورت ہے تو حضورؐ کے چچا ابوطالب کا یہ شعر کافی ہے ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ　　ثمال الیتامی عصمۃ الارامل

وہ ایسے نورانی شکل والے ہیں جن کے چہرے کے وسیلے سے لوگ طلب باراں کرتے ہیں۔ یتیموں کے فریادرس۔ بیواؤں کے محافظ۔"[2]

---

[1] فاران سیرت نمبر صفحہ ۲۸۲ - ۲۸۰ [2] فاران سیرت صفحہ نمبر ۲۸۱ -

یا پھر حضورؐ کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔ "وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا ھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ" والی آیت کی تفسیر کے ذیل میں آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "لَوْ رَاَیْنَ حُسْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَقْتَلْنَ اَنْفُسَھُنَّ" اور قالت کذا۔ یعنی حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر زنانِ مصر حضورؐ کے جمال کو دیکھ لیتیں تو حُسنِ نبویؐ کی تاب نہ لا کر جائے ہاتھ کاٹنے کے حیرت میں آپ ہی کو قتل کر لیتیں۔"[۱]

خیر یہ تو مضمون کی مختصر تمہید تھی۔ زیرِ بحث "اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ" ہے۔ لہٰذا اب اصل مضمون سے گفتگو کی جاتی ہے۔

اقبالؔ کے عشقِ رسول کے اسباب کو مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر

(۲) ابتدائی تعلیم اور ماحول

(۳) اُستاد کی صحبت

(۴) غالبؔ اور حالیؔ کا اثر

(۵) وسیع مطالعۂ کتب اور ذاتی مشاہدات

بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ یہاں تک کہ اپنی نیکی اور پرہیزگاری ہی کی وجہ سے، اپنے شہر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دنیا کے کاموں میں جی بہت کم لگتا تھا۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور دین کی باتیں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اسلام کی محبت، محبت اور پیغمبرِ اسلامؐ کا عشق ان کی زندگی تھی۔ دنیا کے کاموں سے جتنا وقت بچتا اس میں یا بزرگوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے یا نیک لوگوں کی صحبت سے

---

[۱] تفسیر روح المعانی

استاد ہ۔ مولانا روم کے بھی بڑے عاشق تھے۔ مثنوی کے اشعار بڑے لطف سے پڑھا کرتے تھے۔ صوفی منش آدمی تھے مگر ان کا تصوّف ایسا نہ تھا کہ زندگی کے روز مرّہ کے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر گوشہ نشین ہو جاتے، یا کسی... خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ساری عمر اپنی محنت سے روزی کمائی" اور "دل بر یار و دست بکار" پر عامل رہے۔ ساتھ ہی بڑے صابر و قانع اور بڑے سادگی پسند تھے۔ اُن پر مذہب کا رنگ کتنا گہرا تھا۔ یہ بات ذیل کے واقعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

"اقبال ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دن اُن کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے یہاں پہنچے اور کہنے لگے "مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں کہ اقبال آخر انگریزی کی تعلیم پا کر کیا کرے گا! اُسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال اسکول جانے کی بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے۔"[1]

اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں اپنے والد بزرگوار کی خدا ترسی، غریب نوازی اور دینداری کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن ایک گدائے مُبرم ہمارے دروازے پر صدا لگا رہا تھا۔ میں نے غصّے میں آ کر ایک لکڑی اس کے سر پر ایسی ماری کہ جو کچھ مانگ کر لایا تھا وہ بھی اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جوانی کے نشے میں عقل صواب و ناصواب نہیں دیکھتی۔ مگر میرے اس فعل سے والد کو بڑا رنج ہوا، چہرہ افسردہ ہو گیا۔ دل سے آہیں نکلنے لگیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میرا دل کانپ گیا فرمانے لگے قیامت کے دن جب حضورؐ کی اُمّت حضورؐ کے گرد جمع ہو گی۔ غازیانِ ملّت بیضا بھی اور حکمت دین کے حافظ بھی اور شہدا بھی، زہّاد بھی اور عاشقانِ دلفگار بھی۔ عالم بھی اور شرمسار گنہگار بھی۔ سب موجود ہوں گے۔ اور

---

[1] حیاتِ اقبال صفحہ ۱۲۔

اس اجتماعِ امت میں اس گدائے دردمند کا نالہ بلند ہوگا۔ تو اے صراطِ مستقیم سے دور افتادہ سرکش! اس وقت اگر حضورؐ نے پوچھا تو میں کیا جواب دونگا۔ کہ اللہ نے تجھ کو ایک مسلمان نوجوان دیا تھا تو یہ آسان کام بھی نہ کر سکا کہ اس کو آدمی بنا دیتا پھر بیٹے سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

اندکے اندیش و یاد آور پسر — اجتماعِ اُمتِ خیر البشر!
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر — لرزۂ بیم و اُمیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن — پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ — گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت — بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

اے بیٹے! ذرا اُمتِ خیر البشرؐ کے اس اجتماع کا خیال کر اور پھر میری سفید داڑھی اور اس پر امید و بیم کی وجہ سے جسم لرزاں کو دیکھ! باپ پر ایسا نازیبا ظلم روا نہ رکھ اور غلام کو آقا کے آگے رسوا نہ کر۔ تو شاخِ مصطفیٰؐ کا ایک غنچہ ہے مصطفیٰؐ ہی کی بادِ بہاری سے پھول بننے کی کوشش کر (حضورؐ کے خلقِ عظیم سے بہرہ ور ہونا چاہیئے)

اسی طرح انھوں نے بیان کیا ہے کہ "جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انھوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی۔ ایک صبح کو جب میں حسبِ معمول قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا تھا وہ میرے پاس آئے اور فرمایا بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآنِ کریم پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآنِ کریم تم پر اُترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔" [۱]

اقبالؔ نے اپنے ذیل کے شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

---

[۱] اقبالِ کامل صفحہ ۴۔

جب اقبالؔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخل ہونے لگے تو اُن کے والد نے اُن سے عہد لیا کہ تعلیم میں کمال حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگی خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دیں گے۔

اقبالؔ کی والدہ بھی ان کے والد کی طرح دیندار خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی اقبالؔ کی تربیت و نگہداشت دینِ الٰہی کے اسلوب پر کی۔ اقبالؔ نے "والدہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے اُس میں فرماتے ہیں ؎

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر مرے، اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات　　تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

غرضکہ اسلام اور رسولِ اسلام سے محبت اور اولیاء کرام سے عقیدت اقبالؔ کے آبا و اجداد کا خاصہ رہا ہے یہی چیز اُن کے والدین کا فطری جوہر تھی اور یہی ان کو بھی وراثتہً ملی بلکہ اقبالؔ تک آتے آتے یہ شرابِ دو آتشہ سہ آتشہ ہو گئی۔ "التجائے مسافر" میں اپنے ماں باپ کی اس تربیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھ کو

ابتدائی تعلیم اور ماحول کا اثر

اقبالؔ کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا اور اُس زمانے کے مکتبوں میں عربی، فارسی، اُردو اور خاص کر قرآنِ کریم و دینیات ہی کی تعلیم ہوتی تھی۔ پھر ہائی اسکول میں داخل ہوئے تو مولوی میر حسن جیسے متبحر عالم اُستاد ملے جو پرانی وضع کے پکے با اصول دیندار آدمی تھے شاگرد کی ذہانت طبّاعی اور خداداد قابلیت کو تاڑ گئے اور عربی و فارسی کے علاوہ اسلامیات اور حکمت و فلسفہ کی تعلیم بھی دی اور اس پر ایسی کوشش اور توجہ صرف کی کہ ذرّہ کو آفتاب بنا کر چمکا دیا۔ چنانچہ اقبالؔ اپنی نظم "التجائے مسافر" میں اُستاد کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی۔
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ ہے کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

مولوی میر حسن کو درس و تدریس کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ہر وقت پڑھنے والے کتابیں کھولے موجود رہتے۔ مولوی صاحب درس دے رہے ہیں۔ طالب علم سوالات کر رہے ہیں۔ بحث و مباحثہ ہو رہا ہے، غرضکہ علم ہی کے چرچے اور دین ہی کے تذکرے تھے۔ اس علمی و دینی ماحول نے اقبال کی آتشِ شوق کو اور بھی تیز کر دیا۔ یہاں تک کہ انھیں کھیل کود سے دلچسپی نہ رہی یا مطالعۂ کتب میں محو رہتے یا کسی گہرے تفکر میں ڈوبے ہوتے۔ اقبال کی خوش قسمتی دیکھئے کہ اُن کے فلسفے کے استاد اور وہ بھی مسلمان نہیں ایک یورپین عیسائی، فارسی و عربی کے علاوہ اسلامیات سے بھی گہری دلچسپی رکھنے والے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام پر ایک کتاب لکھی جو "PREACHING OF ISLAM" کے نام سے چھپ چکی ہے اور اپنے موضوع پر بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب اور حالی کے اثرات

اقبال نے شروع میں اگرچہ رسماً اصلاحِ سخن مرزا داغ دہلوی سے لی مگر اُن کی طبیعت کو فطری مناسبت مرزا غالب سے تھی۔ وہی فارسی تراکیب جو کہ غالب کا طرۂ امتیاز تھا، اقبال کے ہاں بھی اسی کثرت سے موجود ہیں۔ وہی بلندیٔ فکر، وہی ندرتِ مضامین اور نازک خیالی جو غالب کا سرمایۂ ناز ہے، اقبال کے کلام کی بھی خصوصیات ہیں۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غالب نے نعتِ رسولؐ کا کیسا باغ لگایا ہے۔ اور اس ناواقفیت کا سبب یہ ہے کہ غالب کی بہترین نعت فارسی میں ہیں اور فارسی کا اس ملک میں رواج نہیں رہا۔ ذرا ایک نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ "مہرِ نیمروز" میں حمد کے بعد "زمزمۂ نعت" کے عنوان سے صفحے کے صفحے لکھتے چلے گئے ہیں۔ اور اتنا کچھ لکھنے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ اسی طرح دوسری تصانیف کو بھی بہتر سے بہتر...

نعت لکھ کر زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے اور نعت جس جوش کے ساتھ لکھتے ہیں، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو حضور رسالتمآبؐ سے کیسی والہانہ محبت تھی۔ مثلاً ؎

ز راز نہاں پردۂ بر زدہ — ز ذاتِ خدا بخشرے سر زدہ
تنے نور بخشیدہ کردگار — بوئے ایزد از خویش امیدوار
تن از نور پالودہ سرچشمۂ — دلے ہمچو مہتاب در چشمۂ
جمالش دل افروز روحانیاں — خیالش نظر سوز یونانیاں
بہ پیوند، پیرایۂ خاکیاں — بدم حرز بازوئے افلاکیاں

آب حیواں بہ روشناسی خاک راہش زندہ جاوید است زود عیسیٰ بہ بندگی بندہ منش جاں در تنِ مردہ اندازد..... بہ طرف چمنے کہ دراں چمنش بہ لیجوں نشاندہ اند خضر سبزۂ بیگانہ در شمع انجمنے کہ دراں انجمنش بہ مہمانی خوانده اند آرائی گوئے طور پروانہ۔ کودکان کویش را انجم رخشاں رشتہ بپا در دست۔ سیارہ در طبل انداز و ہمچناں بر جائے ماندہ اند و بیش را از افلاک تو سنان امہ ایراں پیوستہ بیک ہنجار روند و از خطِ دائرہ بدر نروند۔ پلو بندگان جادۂ اثر دانی راستۂ بہ تختِ بہشت چوں سایہ ہمپائے وخلۂ طوبیٰ چوں خضر پیش رو تا ہر قدر بدل جادۂ عرض رہروی دادہ باشند بسایۂ رہ مُریدہ باشند و بر سبزہ گام نہادہ

..... پیش از ہمہ خلق از خدا بہ تشریف ہستی نام دار۔ و بعد از خدا بر ہمہ خلق جہد زندگی سزاوار۔ ستم زدگاں را بداد و داد و درد غم زدگاں را بیاد و یاد در۔ آسمانیاں آستانیاں سروشاں سفتہ گوشاں خاک نشینان درازیٔ سر ترش منشور فرمان روان سلیماں را چناں خوار داشتہ اند کہ بنا داری سطر نقش پائے مورے بند شتہ اند جاں عرش اندر ہے کہ در عالم فرض محال نیز نشانش نیست، اگر ہست جز رشک طالع جبیں سایان سنگ آستانش نیست ؎

مطاعِ آدم و عالم محمدِ عربی — وکیل مطلق و دستور حضرتِ باری

عدو کشے کہ ز چاک کنار تو قیصش — دویدہ تا دل خسرو حرامیت کاری
شہنشہے کہ دبیران دفتر جاہش — بہ جبرئیل نویسند عزت آثاری
افادہ اثرش بر قوائم افلاک — بہ شکل رعشہ اندام آدمی طاری
افاضۂ اثرش در حقائق آفاق — بسان روح در اعضائے جانوبساری

"دو نیمہ گشتن پیکر ماہ در ہفتہ آرنگی حوصلہ معجزہ خواستاراں بودہ است ورنہ در سر انگشتِ نیروے بہم برزدن روزگار را بردہ است"۔۔۔۔

حضورؐ کے دوسرے معجزات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ معجزات ز آثار بزرگی صورت آں بزرگ معنی و صورت است کہ صورت آشنایان را از بہر مشاہدۂ تجلیات الٰہی در عالم صورت ضرورت است ورنہ خواجہؐ را جز بہ چشمے کہ جز ندارانہ بیند نتواں دید و جز بہ دلے کہ جز خدا نداند نتواں دانست۔

ایک نعتیہ غزل اور سن لیجئے ؎

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است — آرے کلام حق بزبان محمدؐ است
آئینہ دار پرتو مہر است ماہتاب — شان حق آشکار ز شان محمدؐ است
تیر قضا بہر آئینہ در ترکش حق است — اما کشاد او ز کمان محمدؐ است
دانی اگر بہ معنی لولاک دارسی — خندہ ہر چہ از حق است ازاں محمدؐ است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد — سوگند کردگار بہ جان محمدؐ است
واعظ حدیث سایہ طوبیٰ فرو گزار — کانجا سخن ز سرو روان محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را — کاں نیمہ جنبشے ز بنان محمدؐ است
در خود ز نقش مہر نبوت سخن رود — آں نیز نامور ز نشان محمدؐ است

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

غالب کی نظم و نثر سے نعت کے یہ نمونے ظاہر کرتے ہیں کہ غالب کی دوسری شاعرانہ خصوصیات کی طرح اقبال، غالب کی نعت گوئی سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ نیز

ہمارے دعوے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ "جاوید نامہ" کی سیرِ آسمانی میں اقبال کی مرزا غالب سے ملاقات ہوتی ہے تو مرزا کی زبان پر اس وقت بھی یہ ترانہ ہوتا ہے کہ ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

غالب کے بعد جس شخص کا اثر انھوں نے قبول کیا ہے، وہ خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ وہی دردِ قوم وہی یادِ ماضی اور عظمتِ رفتہ کے احیاء کی تڑپ، وہی قوم کی پستی اخلاق و زبوں حالی کا رونا اور قوم کے مستقبل کی فکر جو حالی کے ہاں ہے۔ اقبال کے ہاں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جہاں اُن کو حالی کی دوسری باتوں نے متاثر کیا ہے۔ وہاں اُن کے عشقِ رسولؐ میں زمزمہ سنجی نے بھی متاثر کیا ہے۔ جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں :-

"خواجہ حالی مرحوم کے مسدس کے تو وہ عاشق تھے، میرے پاس ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا، اسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن اُس سے مسدس سننے کی خواہش کرتے، حضور سرورِ کائناتؐ کی تعریف میں وہ بند جو "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" سے شروع ہوتے ہیں اور وہ اشعار جو مسدس کے آخر میں ہیں (اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے) انھیں بطورِ خاص مرغوب تھے، اُن کے سنتے ہی اُن کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے اسی طرح کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔" [1]

---

[1] مکاتیبِ اقبال۔

غرضکہ والدین کی تربیت، استاد کی تعلیم اور ماحول کے اثر نے ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق بنا دیا۔ اور غالب، حالی اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام نے اس آگ کو اور تیز کر دیا مگر اس وقت تک ان کا عشق بھی عقیدتی تھا اور نعت گوئی کا انداز بھی تقریباً دوسرے نعت گو شعراء جیسا ہی تھا۔ مثلاً اپنی نظم "بلال" میں لکھتے ہیں ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن ہے تری ظلمتِ تمنا دست موسیٰ پر

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارہ کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ شب کا مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

یا غزل ؎

سراپا حسن بن جاتے جسے کہ حسن کا عاشق
بھلا اے دل جسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟

جھجک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پر
قرار تسبیح پڑھ جھڑکے سب نازک جبینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

یا ترانہ ملی ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جان ہمارا

اگرچہ ان اشعار میں بھی دوسرے شعراء کے مقابلے میں کسی قدر امتیازی شان کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جیسے کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

تاہم زیادہ تر قدیم انداز ہے مگر بعد میں جب ان کا مطالعہ علم وسیع ہوتا گیا اور خصوصاً علوم اسلامیہ کا مطالعہ چنانچہ انہوں نے یورپ کے زمانۂ قیام میں اسلام پر لیکچر دیئے اور اسلامی تعلیم کے فلسفے کا تحقیقی مطالعہ کر کے وہ مقالہ لکھا جس پر ان کو جرمنی یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ اس کے ساتھ ہی یورپ کے حالات کو دیکھ کر ان کے دل میں بیداری کی قوم اور احیائے دین

اسلام کا جذبہ پیدا ہوتو انھوں نے قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا خاص طور پر مطالعہ کیا تاکہ قوم کے سامنے ایک لائحہ عمل رکھ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم اور دوسرے مذاہب کو جانچنے اور اُن سے اسلامی تعلیمات کا مقابلہ کرنے کا بھی موقعہ ملا تو اُن کا عشق ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ عشق جو پہلے محض تقلیدی تھا آخر کار حقیقی عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اب وہ بقول مولانا عبدالمجید سالک :-

"حضورؐ کی ذاتِ والا کو ساری کائنات سے افضل مانتے تھے اور ہر مسلمان مانتا ہی ہے لیکن تمام مسلمانوں کے ماننے اور اُن کے ماننے میں فرق یہ تھا کہ مسلمان اعتقاداً کہتے ہیں کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

لیکن حضرت علامہ تحقیقاً اس عقیدے کو تسلیم کرتے تھے اور جب اس پر گفتگو کرتے تو اتحاد، الہام، مقامِ نبوت، انسانیت کا مل، توازنِ جذبہ و ادراک اور حریتِ انسانی کے مسائل پر نفسیاتِ جدید کے رو سے ایسی سیر حاصل بحث فرماتے کہ کسی مخالف کو بھی حضورؐ کے انسانِ کامل ہونے میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔" [1]

اصل میں اقبال نے یورپ پہنچ کر جب اُس مہذب دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُن کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اُس آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے

---

[1] اقبال نامہ صہ ۴۲

پیچھے فسق و فجور اور معصیت و خدا فراموشی کے وہ اندھیرے ان کو نظر آئے کہ روح کانپ گئی اور مظلوم انسانیت کے لئے آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں۔ بڑی فکر اس بات کی ہوئی کہ آیا یورپ کے زہر کا تریاق ہے بھی یا نہیں۔ کیا دنیا اسی طرح جہنم کدہ بنی رہے گی۔ کیا انسان اسی طرح انسان کا شکار ہوتا رہے گا۔ اور اس مایوسی اور بے چینی کی حالت میں جب انھوں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو انھیں صبح امید کے آثار نظر آنے لگے۔ اور بالآخر ان کے وسیع اور عمیق مطالعے نے اُن پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ ان تمام مصیبتوں کا حل اور ان جملہ امراض کا علاج اسلام میں موجود ہے۔ اب وہ کھلے بندوں اسلام کی خوبیاں اور یورپ کی تہذیب و تعلیم کے نقائص و معائب بیان کرتے ہیں :۔ مثلاً

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت — دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی!
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی!

یورپ کی حالت کیا ہے؟ ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

یورپ کی سیاست کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

می کند بندِ غلاماں سخت تر — حریت می خواند او را بے بصر!
گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید — پردہ بر روئے ملوکیت کشید!
سلطنت را جامۂ اقوام گفت — کارِ خود را پختہ تر در خام گفت

در فضائش بال و پر نتواں کشود | با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغِ قفس اے دردمند! | آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشتِ مرغ | او نباشد ایمن از شاہین و چرخ
از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست | نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست
حریت خواہی بہ پیچاکش میفت | تشنہ میر و بر لبِ تاکش میفت
الحذر از گرمیِ گفتار او | الحذر از حرفِ پہلو دار او
چشمہا از سرمہ اش بے نور تر | بندۂ مجبور ازو مجبور تر!
از شرابِ ساتگینش الحذر | از قمارِ بد نشینش الحذر

یہ سیاست غلاموں کی قید کو اور سخت کرتی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ یہ کم عقل اس کو آزادی سمجھتے ہیں۔ ہنگامۂ جمہوریت کی شور اشوری بھی دیکھ لی۔ ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت کا نقاب ڈالا گیا ہے! اس سیاست کی ہوا میں پر نہیں کھولنے چاہئیں۔ اس سے کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔ پرندے سے کہتی ہے غم نصیب! صیاد کے گھر میں آشیانہ بنا۔ جو کوئی دشتِ چمن میں آشیانہ بناتا ہے، شاہین و عقاب سے محفوظ نہیں رہتا۔ اس کے افسوں سے مرغِ زیرک دانہ مست ہو کر نالہ کرنا بھول جاتا ہے۔ اگر تو حریت چاہتا ہے تو اس کے دامِ پیچ میں نہ پڑ۔ پیاسا مر جانا پسند کر مگر اس کے انگوروں سے دور رہ۔ اس کی گرمیٔ رفتار اور حرفِ پہلو دار سے خدا کی پناہ! آنکھیں اس کے سرمہ سے اور بھی بے نور ہیں اور بندۂ مجبور اس کے ہاتھوں اور بھی زیادہ مجبور ہے ؎

مغربی تہذیب کیا ہے؟

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف!

یورپ کی معاشرت سے

کوئی پوچھے حکیمِ مغرب سے | ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرے کا کمال؟ — مرد بیکار و زن تہی در آغوش

حکمتِ فرنگ سے

تفرقہ میں حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

ایک جگہ اسلامی تعلیمات کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشم او نظر بخور اللہ نیست

او ندانا از حلال و از حرام — حکمتش خامش و کارش ناتمام

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارداں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن ناداں جاں بردن حکمت است

شیوۂ تہذیب تو آدم دری است — پردۂ دم دری سوداگری است

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود

تا ترو بالا نگردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

افسوس یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کی آنکھ اللہ کے نور سے نہیں دیکھتی۔ حلال و حرام کا فرق نہیں جانتا۔ اس کی حکمت خام ہے اور اس کا کام ناتمام۔ ایک قوم دوسری قوم کو کھا رہی ہے۔ ایک بوتا ہے اور دوسرا اس کے حاصل کو اڑا لیتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھین لینا ایک طرف، ان کے جسم سے جان تک نکال لینا حکمت ہے۔ غرضکہ تہذیبِ نو کا شیوہ آدم دری ہے اور آدم دری کا پردہ تجارت کو بنایا ہے۔ ان بینکوں نے تدبیر کی فکرِ چالاک یہود نے آدمی کے دل سے نور چھین لیا ہے۔ جب تک یہ نظام ترو بالا نہ ہوگا دانش و تہذیب سودائے خام رہے گی۔

یورپ کی عورت سے

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

غرضکہ رنگ و نسل کے امتیازات، گورے کالے کا فرق، وطنیت و قومیت کے بتوں کی خوں آشامیاں، مساوات و اخوت کا فقدان، انسان کی انسان کے ساتھ بدترین دشمنی، سود خوری، نفع اندوزی، لوٹ کھسوٹ، آبادھانی، اسی دنیا کو مآل و مقصود بالذات سمجھنا، حیات بعد الموت سے انکار، تن کی فکری روح سے غفلت، ہمدردی، ایثار، مروّت اور غمخواری سے بے تعلقی، عورت کی آزادی، یہ اور اسی قسم کی بے شمار انفرادی و اجتماعی خرابیاں۔ یورپ کی تہذیب اور اس کی معاشرت میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور اس سے پہلے خود اپنے ملک میں ہندو، بدھ، جین اور دوسری اقوام کے حالات کا اچھی طرح مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جب اسلامی تعلیمات پر غور کیا تو معاملہ کچھ اور ہی نظر آیا۔ اسلام کے ہمہ گیر، جامع اور غیر فانی اصولِ مساوات، حُریت، اخوت اور اس کا سیاسی و معاشی نظام، اس کے تہذیب، تمدن اور عمرانی زندگی کے اصول اور پھر صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی زندگی اور پاکیزہ و بے عیب معاشرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آیا تو اُن کو یقین ہو گیا کہ اسلام ہی کے اصول پر عمل پیرا ہونے میں دنیا کی نجات ہے۔ یہی نظامِ زندگی دُنیا کے لئے دارالامان کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مطالعۂ علمی اور مشاہدۂ عینی کے تاثرات کو سب سے پہلے "دو مثنویوں" اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" کے ذریعے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا کے لئے یہ ایک چیلنج بھی تھا اور دعوتِ عمل بھی تھی۔ چیلنج اس طرح کہ اگر اس سے بہتر دستورِ حیات کسی کے پاس ہے تو اُس کو پیش کیا جائے۔ اور دعوتِ عمل اس لئے کہ اگر اس سے بہتر دستور العمل نہیں ہے تو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کی خاطر اس کو قبول کیا جائے اور اس طرح موجودہ خلفشار کو دور کر کے دنیا کو امن و سلامتی اور خوش حالی سے دوچار ہونے کا موقع دیا جائے، اس کے ساتھ ہی اپنی قوم کو بھی یاد دلایا ہے کہ وہ اس نسخۂ کیمیا کو جس نے مسِ خام کو کندن بنا کر دکھایا تھا، طاقِ نسیاں سے اتار کر اپنی زندگی کو پھر اُس کے ذریعے آراستہ کرے۔!

اسلام نے افراد کو جماعت کا بہترین رُکن بننے کے لئے جو ہدایات دی ہیں ان کو اقبال نے "اسرار خودی" میں بیان کیا ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا، بلند مقاصد کی تولید اور ان کے حصول کی جدوجہد کے ذریعہ مصروفِ عمل رہنا۔ نفیٔ خودی، ترکِ آرزو اور زندگی کی دشواریوں سے فرار اختیار کرنے کو مذموم اور حلال کو حرام سمجھنا اس سے خودی ضعیف ہوتی ہے، خودی کو عشق کے ذریعہ محکم بنانا تاکہ وہ نظامِ عالم کے قویٰ مخفیہ و ظاہرہ کو مسخر کر سکے۔ تربیتِ خودی کے لئے اطاعتِ قانونِ الٰہی اور ضبطِ نفس کا مکمل نصاب یعنی کلمہ طیبہ کی حقیقت کا سمجھنا، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا سختی سے پابند ہونا کہ ان میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد نیابتِ الٰہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا کہ یہ انسانیت کی معراج ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصدِ اعلا کلمۃ الحق قرار دینا اور اس بلند اور پاکیزہ مقصد کے تحفظ اور بقا کے لئے جہاد کرنا اور جہاد کے علاوہ ہر قسم کی جنگوں کو حرام قرار دے دینا۔ ارکانِ اسلام کی پابندی کے ذریعے وقت کی قدر، نظم و ضبط اور توجہ الی اللہ اور اطمینانِ دل کا بہترین سبق دینا وغیرہ۔

اجتماعی و ملی زندگی کے متعلق اسلام کی برکات کو "رموزِ بیخودی" کے ذریعہ بیان کر کے اسلام کے بتائے ہوئے آئین کو حیاتِ ملی کے لئے بہترین ضابطہ قرار دیا ہے اور اس ضمن میں مختلف اسلامی اصولوں پر تبصرہ کر کے اپنے پیش کردہ نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں۔ اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان متنبیوں کے ذریعہ حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں۔"

جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ
سے ہوئی۔ [1]

اسلام نے فرد و ملت کے ربط باہم پر کس قدر زور دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے" ؎

تزدِ جاں کن گفتہ خیر البشرؐ ہست شیطاں از جماعت دُور تر

اور جس طرح جماعت فرد کے بغیر وجود میں نہیں آتی، فرد بھی جماعت کے بغیر زندہ و پائندہ نہیں ہو سکتا دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد کی عزت قوم سے ہے اور ملت کا نظام افراد سے ہے۔ فرد جماعت میں مل کر قطرہ ناچیز سے قلزم بیکراں ہو جاتا ہے۔ جب تک تنہا ہے مقاصد سے غافل ہے اور اس کی قوتیں منتشر ہیں۔ جب قوم سے وابستہ ہو جاتا ہے تو قوم اُس کو ضبط و نظم سے آشنا کر کے ہر طرح کی غلامی سے آزاد کر دیتی ہے۔ حلقۂ آئینِ جماعت میں گرفتار ہو کر خوئے رم چھوڑ دیتا ہے اور اپنے ہی حُسن و جمال کا اسیر، اپنے ہی اصول و روایات پر فریفتہ اور اپنے ہی نظریات کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی ادائوں پر دل کو فدا کرنے کی بجائے قوم کے آئینہ میں اپنی ادا دیکھتا ہے اور اپنا ہی عاشق ہوتا ہے۔

اسلام نے فرد کو اعلیٰ مقاصد کے لئے جماعت میں گم ہونے کی تعلیم دی ہے۔ اور فرد کی خودی اور اس کی تربیت و استحکام کی غرض و غایت ہی یہ بتلائی ہے کہ ایک بہترین جماعت وجود میں آئے جو

---

[1] مکاتیبِ اقبال۔ صفحہ ۲۴

"کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" کا مصداق ہو۔ فرد جماعت میں مل کر قطرہ سے دریا اور برگِ گل سے چمن ہو جاتا ہے تو جماعت بھی ایسے افراد کی بدولت جو اپنی تمام انفرادی و شخصی صلاحیتوں کے ساتھ جماعت میں داخل ہوتے ہیں، محکم اور قوی ہوتی ہے ؎

در جماعت خود شکن گردد خودی — تا ز گلبرگے چمن گردد خودی
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرہ وسعت طلب قلزم شود

اور جماعت میں مل کر افراد کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ؎

مردماں خوگر بیک دیگر شوند — سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
در نبردِ زندگی یارِ ہم اند — مثلِ ہمکاراں گرفتارِ ہم اند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است — ہستی کوکب ز کوکب محکم است

جماعت کا قیام تو اختلاطِ افراد سے ظہور پذیر ہو جاتا ہے مگر اس کی تعمیر و تکمیل کسی زندہ عقیدے یا قانون کے ذریعے مربوط ہو کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ملتِ اسلامیہ کی تکمیل، تربیتِ نبوت کے ذریعہ ہوئی ہے۔

اسلام نے توحید و رسالت پر ایمان کی بنیاد رکھی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا دامن چھوٹا اور ایمان کی عمارت زمین پر آ رہی۔ توحید کے ذریعہ انسان تمام مکروہات سے محفوظ رہتا ہے۔ مایوسی اور حزن و ملال کیوں کر باقی رہ سکتا ہے۔ جب کہ یقین ہو جائے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس سے غلطی، سہو، یا زیادتی سرزد نہیں ہوتی۔ جو سمیع و بصیر بھی ہے اور ہمہ داں و قادرِ مطلق بھی۔ اور جب تک ہم اس سے وابستہ ہیں ناکامی و نامرادی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا اور ہماری کوششوں کا ثمرہ مل کر رہے گا۔ اقبالؔ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست — زندگانی محکم از لا یَنْقَطِعْ ہ ست

اے کہ در زنداں غم باشی اسیر — از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلب او از لا تخف محکم شود

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اور لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا سے انہی کو تقویت و طمانیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے جو پرستارانِ توحید ہیں ورنہ حزن و ملال، مایوسی اور خوف کا علاج مشکل ہے۔ اس لئے اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

رسالت کے ذریعے اسلام نے اُن تمام نظریات اور اصول کے ممکن العمل ہونے کو بھی ثابت کیا جو اس نے پیش کئے تھے اور نوعِ انسانی کے لئے باعثِ خیر و برکت ہونے کو بھی۔ اس لئے کہ اسلام کے رسولؐ نے ان پر خود عمل کر کے دکھلایا اور اُن اصولوں کے ذریعے ہی آپ کی زندگی ہی میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا کہ چشمِ فلک نے نہ ایسا کبھی پہلے دیکھا اور نہ آئندہ دیکھ سکے گی۔ اقبال نے ذیل کے اشعار میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں خلاقِ آئینِ جہاں داری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقر و فخری کا رعنائی میں شاہانہ — "آبا" رنگ و خالِ خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تم سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے! — جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

یہ معاشرہ اسلام کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی و روحانی اصولوں پر قائم ہوا تھا اور انسان کے لئے سراپا رحمت و رافت اور فلاح و برکت ثابت ہوا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ جانشینانِ رسول اللہ نے اپنی زندگیوں کو حضورؐ کے اسوۂ پاک کے سانچہ میں ڈھال کے دنیا کا نقشہ بدلا تھا۔ جب تک کسی نظریے کے پیچھے زندہ و پائندہ شخصیت کارفرما نہ ہو وہ نظریہ تاریخ کے صفحات کی زینت تو ہو سکتا ہے مگر دنیا میں انقلاب نہیں لا سکتا۔ اور کوئی زندہ و پائندہ سوسائٹی محض نظریات و اصول کے ذریعے قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ نظریات عمل کے ذریعہ افراد کے کردار و گفتار میں متشکل ہو کر اپنی نفع بخشی ثابت نہ کر دیں۔ نیز حضور رسالتمآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل رکھا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حریت، مساوات اور اخوت نوعِ انسانی کی بنیاد رسالتِ محمدیہ کے ذریعہ ہی رکھی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عالم انسانی کی فلاح و بہبود ان حقائق سہ گانہ کی تشکیل و تعمیم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان ہی صفاتِ مذکورہ کی وجہ سے اسلام زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گزاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لا نبی بعدی ز احسانِ خداست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است

اسی حریت، مساوات اور اخوت کی بنا پر اسلام کے اصولوں پر قائم ہونے والی سوسائٹی جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر ساری دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام ساری دنیا کے لئے پیغامِ امن و راحت بن کر آیا ہے نہ کہ محض مسلمانوں کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں اسلام کے

خدا کو رب العالمین، رسول کو رحمۃ العالمین کے لقب سے یاد کیا ہے وہاں اپنے آپ کو بھی "ھُوَ ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ" کہا ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ اپنے اصول اور تعلیمات کی جامعیت و ہمہ گیری کی وجہ سے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ تو اس کے نزدیک رنگ و نسل اور ملک و وطن کے امتیازات بھی کیونکر پیدا ہو سکتے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

ہوئے ما با مقام بستہ نیست | بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندو چینی سفال جامِ ماست | رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست | مرز و بوم او بجز اسلام نیست
می نگنجد مسلمہ اندر مرز و بوم | در دلِ او بادہ گردد شام و روم

اسی طرح قیدِ زماں سے آزاد ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خدا است | اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
ز احبار این قوم بے پرواستے | استوار از محکم تنزیلِ ما ستے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است | از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا ان یطفؤا فرمودہ است | از فسردن این چراغ آسودہ است

خدا فرماتا ہے "نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" ہم نے ذکر ہی ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ ذکر کی حفاظت سے ذاکر کی حفاظت لازم آتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان نہ ہوں اور قرآنِ کریم ہو۔ قرآنِ کریم ہے تو مسلمان بھی ہیں۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ"

چاہتے ہیں بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ پھونک سے اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کرے گا، خواہ کافر برا مانا کریں۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا یہ چراغ کفّار اپنی پھونکوں سے نہیں بجھا سکیں گے تو پھر اس چراغ کے بجھنے کا اندیشہ کس کو ہو سکتا ہے! اور یہ حفاظت بے وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ صرف یہی اُمّت ہے جو تخلیقِ عالم کے مقصد کو پورا کر سکتی ہے ؎

اُمّتے در حق پیمبر شتے کاملے — اُمّتے محبوبِ ہر صاحب دلے
حق بروں آورد ایں تیغِ اصیل — از نیامِ آرزو ہائے خلیلؑ
تا صداقت زندہ گردد از دمش — غیرِ حق سوزد ز برقِ جبہتش
ما کہ توحیدِ خدا را حجتیم — حافظِ رمزِ کتاب و ملتیم

ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے آئین بھی ضروری ہے۔ اور ایک ایسی ملّت کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی جو آخری اُمّت ہے اور قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بن کر آئی ہے، آئین بھی ایسا ہی جامع، ہمہ گیر اور لازوال ہے جو انسان کے ہر شعبۂ حیات کے لئے مکمل ہدایات کا حامل ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہنمائی کرتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — درنتد با سنگِ جاں از زورِ او
تا پرِ ما بندد آزاد آورد — صیدِ بنداں را بہ فریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃ اللعالمیں
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابِ صاحبِ دفتر شدند
دشتِ پیمایاں ز تابِ یک چراغ — صد تجلّی از علوم اندر دماغ!

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ — دستگیرے بندہ کیرے را ز مرگ
ضربت قرآں تا در ایں عالم نشست — نقش باطل ماند و باطل رفت و جست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتاب نے ست چیزے دیگر است
چوں بمیرد رشتۂ جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مرد حق پیماں ز نیروئے ایں — زندہ و پائندہ و گویائے ایں
اندر و تقدیر یزداں غرب و شرق
گرچہ اندیشہ نبیند لیک جز برق

تجھے بتاتا ہے تیرا آئین تعمیر اس آسمان کے نیچے تیری عزت کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کلام ہے جو قرآن حکیم ہے جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے، جو حیات انسانی کے لئے سچا راز ہے۔ جس کی قوت سے ناپائیدار پائیدار ہو جاتا ہے جس کا ہر حرف ریب و تبدل سے محفوظ ہے۔ جس کی آیات شرمندۂ تاویل نہیں ہیں، جس کے زور سے جام پتھر سے لڑ جاتا ہے، خدام جس کے پاس آتے ہیں تو آزاد و بے خوف کر جاتے ہیں۔ جس سے ظالم نالاں ہیں۔ جو نوع انسانی کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ جس کا نام رحمۃ اللعالمین ہے، جس کی بدولت رہزن رہبر بن گئے۔ اور دو حنیفوں سے اس ایک چراغ کی روشنی سے علوم کی سینکڑوں قندیلیں اپنے دامن میں بھر لیں۔

قرآن کیا ہے؟ خواجہ کے لئے پیغام مرگ اور بندہ کے لئے دستگیر۔ جب قرآن کا القائی امر عالم میں قائم ہوا تو باطل کے نقوش باطل ہو گئے۔ دور حاضر میں سب پر واضح ہو گیا ہے کہ یہ کتاب نہیں ہے اور یہ کوئی چیز ہے۔ دل میں اترتا ہے تو دل کی حالت بدل جاتی ہے۔ اور جب دل بدل جاتا ہے۔ تو جہاں بھی بدل جاتا ہے۔ خدا کی طرح عیاں بھی ہے۔ اور پنہاں بھی۔ زندہ و پائندہ ہے۔ اس میں مغرب کی تقدیر بھی پوشیدہ ہے۔ اور مشرق کی بھی۔ اور انسان کے خیال میں برق کی سرعت پیدا کرتا ہے۔

حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی و استحکام کے لئے ایک مرکز مخصوص بھی ضروری ہے۔ اور ایسی ملّت کے لئے جو وحدتِ مقصد اور وحدتِ نصب العین میں یکتا و یگانہ ہے۔ مرکز بھی ایک ہی ہے۔ اور ایسی بلند روایات کا حامل ہے جو اس ملّت کے شایانِ شان ہیں۔ یعنی "بیت الحرام" جو توحید کا سرچشمہ اور ملّتِ ابراہیمیؑ کی جائے ولادت ہے۔ اقبالؔ اس مرکز کی تعریف کرتے ہیں ؎

قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و راز ما بیت الحرام — سوزِ ما ہم ساز ما بیت الحرام
از حجابِ او یکی لیلا ریت — پختہ از بندِ نمود و ما ریت
تو ز بیوندِ حرم بے زندہ! — اطرافِ او کن پائندہ
در جہاں جانِ اُمم جمعیت است — در نگر تا حرم جمعیت است

اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کا نصب العین بھی ایک ہے، وحدتِ نصب العین میں اس کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کی تبلیغ سے ملّت کی رگوں میں زندگی کا خون رواں ہے۔ اگر وحدتِ مقصد نہ ہو تو افراد میں ربطِ حقیقی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور ربطِ حقیقی کے بغیر ہجومِ افراد تو ہو سکتا ہے، ملّت نہیں ہو سکتی۔ اور جب کہ نصب العین ایک اور اتنا بلند ہے۔ یعنی "حفظ و نشرِ توحید" تو ایسی ہی جماعت دنیا میں حقیقی جمعیت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ اول مطلق مدعا کی تعریف کرتے ہیں ؎

مدعا از بقائے زندگی — جمع سیماب قوائے زندگی
چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود
مدعا مضرابِ ساز ہمت است — مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم را جنباند او — یک نظر صد چشم را گرداند او

اس کے بعد ملتِ اسلامیہ کے مدعا و مقصد کی تعریف کرتے ہیں ؎

نقطۂ پرکارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

چرخ را از زورِ او گردندگی — مہر را تابندگی رخشندگی

در نوا داری چو خون در تن رواں — خیز و مضرابے بتارِ او رساں

زانکہ در تکبیر پنہاں بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

اسلام نے تو سیلِ حیاتِ ملی کے لئے موجوداتِ فطرت کی تسخیر پر زور دیا ہے قرآنِ کریم میں انسان کے علوِ مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے جا بجا ارشاد ہوا ہے کہ چاند تارے، سورج، پہاڑ، دریا، برق و باراں، انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور انسان کو وہ صلاحیتیں دے دی گئی ہیں کہ اُن سے کام لے کر وہ ہر چیز کو تسخیر کر سکتا ہے۔ اور یہ بات اسلام نے اس وقت کہی کہ جب دنیا قوائے فطرت کی تسخیر کی بجائے اُن کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی آرام پسند زندگی سے اگر اس حقیقت کا ثبوت نہیں ملتا کہ اس قوم نے قرآنِ کریم کے حکم کی تعمیل میں کبھی تسخیرِ موجودات کی ہو گی تو قرآنِ کریم کی اصل تعلیم اور تاریخ کے حقائق سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔ ..

بقولِ اقبالؔ، اسلام تو یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اور یہ تسخیر کسی مادّی منفعت، آسائشِ تن اور نفسانی کامرانی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے معرفتِ خودی اور عرفانِ الٰہی وابستہ ہے ؎

ہستیِ حاضر کند تفسیرِ غیب — می شود دیباچۂ تسخیرِ غیب

سوا از بہر تسخیر اسمان و بس | سینۂ او عرصۂ تیر است و بس
از کمین حق ما صد آشکار | تا شود پیمان تو سنداں گزار
رشتۂ با پیر گرہ اندر گرہ | تا شود لطف کشودن را فرہ

کوہ و صحرا دشت و دریا جو بجو | تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افسوں خفتۂ | عالم اسباب را دروں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مجبور را | دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است | امتحان ممکنات مسلم است
گیر اورا تا بگیرد اوترا
ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا
ثابت و سیارۂ گردوں وطن | آں خداوندان اقوام کہن
ایں ہمہ اے خواجۂ آغوش تو اند | پیش خیز و حلقۂ در گوش تو اند
جستجو را محکم از تدبیر کن | ہر نفس و آفاق را تسخیر کن
تو کہ مقصود خطاب انظری | پس چرا ایں را چوں کوراں بری

آج مہذب دنیا کے رہنے والے احسان کی دیکھا دیکھی مغرب زدہ مسلمان بھی اسلام کو ہدف طعن بناتے ہیں کہ عورت کو اسلام نے آزادی کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اور موسائٹی میں اس کو کوئی درجہ نہیں دیا۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کے سبب اسلام کو خصوصیت سے دوسرے مذاہب پر تفوق حاصل ہوا اسی پر اس کو مطعون کیا جائے! یورپ کے لئے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے ست
مگر اپنے بھائیوں کی خیرہ چشمی و کور باطنی کا کیا علاج!

کہنا پڑتا ہے کہ ؎

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست!

اسلام نے عورت کا مقام بھی متعین کیا ہے اور اس کی حدود عمل بھی متعین کی ہیں۔ اور سوسائٹی میں اس کو اتنا اونچا مقام دیا ہے کہ آج تک کسی مذہب نے نہیں دیا۔ عورت کو بالکل آزاد چھوڑ کر فلم ایکٹریس، رقاصہ، مخنث اور بیسوا بنا دینا عورت کو عزت بخشنا نہیں ہے بلکہ اس کو ذلت کے قعر اتھل میں پہنچا دینا ہے۔ اس لئے اسلام نے عورت کو ایسی عزت سے یقیناً نہیں نوازا ہے۔ نیز عورت کو عورت ہی رکھا ہے۔ مرد بننے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

نشئہ رقص مردان زن است — نسخہ دلبری مشرق را پیراہن است

یہ قرآن کے ارشاد هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ کا ترجمہ ہے۔ عورتیں مردوں کا لباس ہیں۔ مردوں کے بے شمار عیبوں کا پردہ عورتوں ہی سے ہوتا ہے ؎

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات — ذکرہ فرمود الطیب و صلوٰۃ

یہ حضورؐ کی حدیث مبارک کی طرف اشارہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے تمہاری دنیا میں سے نماز، خوشبو، اور عورت کو محبوب رکھا ہوں۔ غور کیجئے حضورؐ کے اس ارشاد سے عورت کا مقام کتنا بلند ہو جاتا ہے ؎

مسلمے کو را پرستار شمرد — بہرۂ از حکمت قرآں نبرد

اقبال کہتے ہیں کہ جو مسلمان، عورت کو کنیز سمجھتا ہے وہ حکمت قرآن سے بہرہ نہیں رکھتا ؎

ملت از تکریم ارحام استوار — ورنہ کار زندگی خام است و بس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؎

اور جس صلۂ رحمی کا اللہ نے حکم دیا ہے اُس کو توڑتے ہیں۔ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خسارے میں ہیں ؎

حافظِ رمزِ اخوت مادراں — قوتِ قرآں و ملّت مادراں
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں — زیرِ پائے اُمّہات آمد جناں

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جنّت ماں کے پیروں تلے ہے۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ ؎

اقبالؔ نے اسلام کی اس زندہ تعلیم کو زندہ عملی صورت میں حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حیاتِ طیبہ میں دیکھ لیا ہے۔ اس لیے خواتینِ اسلام کو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے بعد اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں اسلام کے اصول و نظریات ہی کے نئے نئے پہلوؤں میں تعریف و تشریح کی ہے۔ مثلاً

اسلام نے جنگ کا کیا معیار مقرر کیا ہے؟

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

نماز کیا ہے؟

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مومن کی شان کیا ہے؟

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش — خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن!
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں — جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن!

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن: — گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں، بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کے سرود ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان
تقدیر کے پابند جمادات و نباتات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

ایک جگہ مومن سے خطاب کرتے ہیں ؎

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری!

کافر و مومن کا فرق بتاتے ہیں ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
کافر ہو تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ — مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

غرضکہ اب ان کو یقین کامل ہو گیا کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا نظام انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ صرف اسلام ایسا مذہب ہے

جو مکمل [illegible] رکھتا ہے۔ ایسا ضابطہ جو زمان و مکان کی قیود سے [illegible]
پوری قوت انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس انکشاف حقیقت سے [illegible]
والبانہ گرویدگی پیدا ہوئی اور اسی گرویدگی نے [illegible] کے [illegible]
صورت اختیار کر لی۔ اور یہ ایسا عشق تھا جس کی بنیاد سائنسی تحقیق
و جستجو اور تخلیقی پرکھ ہے۔ اس یقین کے بعد ان کی صرف ایک خواہش تھی [illegible]
اسلام کے اصول کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ اس کو ایک گھر [illegible] بلکہ
ایک ایک شخص تک پہنچایا جائے۔ اور اس کو وہ لوح انسانی کی سب سے [illegible]
سمجھتے تھے۔ اسی لئے چاہتے تھے کہ ایک ایسا اسلامی دارالاشاعت قائم ہو جو
اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائے۔ ایک ایسی لائبریری ہو
جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں موجود ہوں اور ایک ایسا ادارہ ہو
جس کے ذریعہ علوم اسلامی کا احیا کیا جا سکے۔ ان کے خطوط سے جو انہوں نے
اپنے احباب اور مقربین سے [illegible] کی [illegible] اور ان کے [illegible]
سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض تحریرات کے ضروری اقتباسات نقل
کئے جاتے ہیں۔

ایک خط حضرت [illegible] کے نام [illegible] میں
لکھا [illegible] کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں ایسا
ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں دکھائی نہیں آئی۔ ہماری
خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے [illegible]
سائی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہمارا یہی
ارادہ ہے کہ [illegible] کے [illegible] تاریخ، تحصیل حضرات اور

[illegible] ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جو اعلیٰ درجہ کی فنی صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ اور جو اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شعور و تہذیب سے دور ایک گوشے میں ایسا محل بنانا چاہتے ہیں۔ جو ان کے لئے ایک علمی اور ثقافتی مرکز ہو۔ اور ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں ہر قسم کی جدید و قدیم کتاب موجود ہو اور ان کی رہنمائی کے لئے ایک ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل عالم ہو اور قرآن حکیم میں بصیرت تامہ رکھتا ہو اور ... انقلاب دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرے اور تعلیماتِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں بھی ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور ہدایات کے ذریعہ تمدنِ اسلام کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔" [1]

ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل پر ممالکِ اسلامیہ کی موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل بالکل مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ حال میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خدا نصیبی خوب

[1] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۴۱

جانتا تھا مگر اسلام سے بالکل بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات شاید ہی میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔" [1]

ایک دوسرے خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"اس وقت بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ فلسفۂ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپکے اس کام کو کون کرے گا۔ ہندوستان کی جمعیۃ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلباء کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو۔" [2]

مسٹر نیاز احمد صاحب ایم۔ اے (دہلی) کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے خیال میں آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ آپ کو اسلام، اس کی مذہبی اور سیاسی تاریخ، اس کے کلچر اور اس کے بحران کا مطالعہ کرنا چاہئے جو ٹرکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں مغرب کے افکارِ جدید کے اسلامی زندگی اور افکار پر اثر نے پیدا کر دیا ہے۔ آپ عیسائیوں سے زیادہ اسلام پر کتابیں لکھ کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلام میں تنخواہ دار مبلغین کی انجمنیں کبھی نہیں تھیں۔ تبلیغ کا کام انفرادی کوشش اور سرگرمی پر

---

[1] مکاتیب اقبال صفحہ ۱۵۵ [2] مکاتیب اقبال ۴۲

موقوف رہا ہے۔ افریقہ کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا ایسے مسلمانوں کی انفرادی کوشش کا مرہونِ منت ہے جن کے پاس اس خدمت کے ظاہری وسائل موجود نہ تھے۔ ہندوستان میں بھی اشاعتِ اسلام کا کام شخصی اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے"۔[1]

حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کو لکھتے ہیں۔

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس، جرمنی اور انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہر طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یورپ جانا بے سود ہے"۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجئے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمدؐ عربی کی اصلی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمتِ اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے۔[2]

پروفیسر جی۔ ایس چٹرجی لکھتے ہیں:۔

"اقبال کی قوتِ فکر نے اُسے مشرق اور عالمِ اسلام کے اُن مصائب کے اسباب و علل سے آگاہ کیا اور اُس کی عواقب

---

[1] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۲۶۰

[2] " " " ۳۹۸

نظروں نے ان امراض کا مداوا اور اُن سیاسی و زریوں حالات سے نجات پانے کا اُن کو راستہ بتا دیا۔ چنانچہ اس دور میں اُن کے مُنہ سے بجا بے لبندی ترانے کے اسلامی ترانہ ادا ہوا اور وطنیت کی محدود فضاؤں سے نکل کر وہ عالمگیر قومیت کی پیام رسانی کرنے لگے۔ اقبال کے نزدیک اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے جو انسان کی تقدیر، ذہن اور اس کی قابل فتح روح کے تمام امکانات پر حاوی ہے۔"[1]

اقبال نے اس تصور کے تاثر کا اظہار ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اب ان کے نزدیک اُس انسان کا جینا نہیں ہے جو چاند اور سورج کو دیکھ کر رات کی تاریکی چھوڑ دیتا اور اُن کی روشنی میں آسودگی حاصل کرتا ہے۔ بلکہ جینا وہ ہے جو انسان کو زندہ کرتا ہے۔ بلکہ اُن کا عشق اُس بالغ انسان کا عشق ہے جو چاند اور سورج کو اس لئے روندتا ہے کہ اس کو نظام عالم سے بڑا دخل ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو دنیا خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے۔

بعض پچھلے شعراء نے عشق رسولؐ کے تراشے اس انداز سے کئے ہیں کہ اُن سے ان کی رنگینی و شیفتگی کا اظہار تو ہوتا ہے مگر یہ بہت کم پتہ چلتا ہے کہ حضور سرور کائنات کی سیرت نے انہوں نے کیا اثر قبول کیا ہے۔ یہ انداز ہے جو موجودہ دور کے شعراء کی رہنمائی کا سا ہے۔ کہ وہ دنیا کا شعور تو زمین سے

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۲۔

آسمان ہے کہ یا گلہ ہے نہیں معلوم ہے اور شعر کی کونسی خوبیوں نے اُن کو اس تحسین و آفرین کے لئے مجبور کیا ہے۔ برخلاف اس کے کہ اقبال کا اظہار عشق حسن سخن شناس کا ہے جو شعر کی خوبیوں کو ایک خوش ذوق اور سبحان اللہ کہتا ہے۔ اور شعر کے محاسن کی طرف متوجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ یعنی محض تعریف نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا غور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضورؐ کی ذات اقدس دنیا پر ابر رحمت بن کر برسی ہے اور ایک برس ہے کہ ایک نبی کی تمام کاوشیں دور ہو گئی ہیں۔ اور آج بھی اگر اخلاقی روشنی کو نظر آتی ہے تو وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باری کے آثار باقیہ ہیں۔ ذکر کر دیں۔ حضورؐ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر آجائے تو موجودہ تاریکیاں... چھٹ کر آدمیت، اسلام کی ضیا پاشیوں سے پھر منور ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ بیان کر اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔ اور اُنہیں اقوال کو خود عمل کر کے دکھاتے ہیں کہ اس طریقہ سے دنیا کے گوشے گوشے کو روشناس کر دیں۔ یعنی ؎

حدیث دیدہ من آن ست کہ یاران ہمہ گفتند
بگفتار اندر و نم تا ہمہ یاران ہمہ گفتند

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی محبت ہر صاحب عقل و بصیرت کو ہونی چاہیئے عقل و بصیرت ہوتے ہوئے بھی کسی کو محبت نہ ہو تو حیرت کی بات ہے۔ اسلام سے محبت کا باعث اس کے دو نظریات ہیں جن کا اجمالی ذکر ابھی کیا گیا جیسا ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ سے محبت اس لئے کہ ان کے ذریعہ دنیا کو وہ کتاب ملی جو اس جامع و ہمہ گیر تعلیم کی حامل ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس نے کتاب دنیا کے سامنے لا کر رکھ دی بلکہ اس کے معانی و مطالب بیان کر دیئے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کو اپنے اعمال و کردار کے

ذریعہ زندہ و فعال صورت میں بھی دکھلا دیا۔ لہٰذا یہ کتاب اس کے اخلاق کا آئینہ اور اس کی ۔ ۔ ۔ سیرت کا مرقع بھی ہے۔ جہاں دوسرے مذاہب کی نہ کتابیں محفوظ اور نہ حاملانِ کتب کے حالاتِ زندگی محفوظ، وہاں اسلام کی کتاب بھی محفوظ ہے، اور اس کے پیغمبر اسلامؐ کے حالاتِ زندگی بھی محفوظ ہیں۔ پس قرآن پاک آئینِ حیاتِ انسانی بھی ہے اور مرقعِ اخلاقِ پیغمبرِ اسلام بھی۔ اور پیغمبرِ اسلام صاحبِ کتاب بھی ہیں اور اپنی سیرت کے اعتبار سے کتاب بھی ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

یہی وجہ ہے کہ جہاں آپ کی سیرت دنیا نے قرآن کے حرفوں میں مرقوم دیکھی وہاں آپؐ کے اصحابؓ کی زندگیوں میں متحرک و انقلاب آفریں بھی دیکھ لی پھر وہ سیرت ایسی جامعیتِ کبریٰ کی مالک کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جو اس آفتابِ عالمتاب کی روشنی سے محروم ہو۔ انفرادی زندگی ہو خواہ اجتماعی۔ خواہ نجی ہو خواہ شہری سب کے لئے برابر روشنی پہنچ رہی ہے۔ معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات اور عمرانیات کے علماء جمع ہوں۔ اور حضورؐ کی زندگی کے ایک ایک باب اور ایک ایک فصل بلکہ ایک ایک حرف روایت، درایت اور جدید سے جدید اصولِ تحقیق و تنقید کی روشنی میں پرکھیں ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اس کی اکملیت و جامعیت، اور پاکیزگی اور لطافت کو دل و جان سے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوں گے ؎

الٰہی اس طرح بھی وہ بتِ طناز آ نکلے
کہ آجائے نصیحت واعظ و دیندار کے آگے

اقبالؔ نے بھی اپنی ہمہ گیر صلاحیتوں کی عینک سے کتاب و سنّت کے

آئینوں میں جب اس حسن کائنات کے حسن و جمال کا مشاہدہ کیا تو ہزار دل و جان سے اس کے عاشق ہو گئے۔ کیسے عاشق ہوئے اس کا اندازہ ذیل کے چند بیانات سے کیجئے:-

مولانا سالک فرماتے ہیں "اُن کے گداز قلب اور رقت احساس کا یہ عالم تھا کہ جہاں ذرا حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت و رحمت یا حضور رحمۃ للعالمین کا ذکر آتا تو حضرت علامہ کی آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو جاتیں اور دیر تک طبیعت نہ سنبھلتی"[1]

حکیم محمد حسن قرشی تحریر فرماتے ہیں "اس شیفتگی اور عشق کا اندازہ مشکل ہے جو اُن کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا۔ حضورؐ کا بیحد احترام کرتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان "محمد صاحب" کہتا تو یہ بہت تکلیف محسوس کرتے"[2] اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ "زندگی کے آخری دنوں میں کچھ لوگ اُن سے ملنے گئے۔ دیکھا کہ طبیعت بہت بے چین ہے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔ پوچھا خیر ہے؟ کہنے لگے آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس کا انجام کیا ہوگا! کئی دن تک اس واقعہ کا اثر ان کے دل پر رہا"[3]

"زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ حال ہو گیا

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۲۱، ۲۲
[2] اقبال نامہ صفحہ ۵۲ [3] حیات اقبال صفحہ ۱۱۵۔

تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام آغاز سے اختیار فرماتے تھے۔[1]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں "جناب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبال اور مقبول حسین و محمود اور ایک دو اور شہر کے قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرہ میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ سب نصیب ہوئے ہیں اس نے بوریے پر سو کر زندگی گزار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر سونا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب خادم کو قرار آیا تو اس کو بلا کر اپنا بستر بچھوایا۔ اور ایک چارپائی اسی غسل خانہ میں بچھوا کر جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔"[2]

زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ مولانا اسلم جیراج پوری ملنے کے لئے گئے کہ دیر تک مسئلہ گفتگو جاری رہا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ آپ حج کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر جسمانی کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادۂ سفر حج میں ہوں مگر وہ سفر کبھی کا ہو رہے ہیں۔ جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں جانے سے پہلے کبھی

---

[1] جوہر اقبال صفحہ نمبر ۳۹

[2] " " " " ۳۶ و ۴۰۔

واپسی مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے۔ جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تو باش اینجا نہ با خاصاں پیامیز
کہ من دارم ہوائے کوچۂ دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر موضوع سخن بدلنا پڑا۔"[1]

اس زمانے میں حج اور زیارت حرمین شریف کا شوق اس قدر زیادہ ہوا کہ اکثر یہی ذکر کیا کرتے۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

"میں ۷ اپریل کی شام کو حاضر ہوا تو ایک صاحب حضرت مرحوم کے پاس بیٹھے تھے۔ میرے پہنچنے پر اُن صاحب نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ابھی تو آپکو حجاز جانا ہے۔ حضرت فرمانے لگے کہ سہارنپور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے حرم پاک کا طواف کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی کہ آپ کو بھی حرم پاک پہنچنا نصیب ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہو گئی ہے۔ پھر فرمانے لگے، اب تو حجاز پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔"[2]

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں ایک روز حجاز یہ منزل سے ان سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک صحبت رہی، وہ اُس وقت

---

[1] آثار اقبال صفحہ نمبر ۹۔ [2] اقبال نامہ صفحہ نمبر ۷۰۔

بہت کمزور تھے۔ سفرِ مدینہ طیبہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے جس قدر تھوڑی سی طاقت کچھ میں باقی رہ گئی ہے، میں اسے مدینہ کے سفر کے لئے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ اُن کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور وہ دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

اقبال کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا اُن کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا، اس لئے میں نے اُن کے سامنے تو نہیں کہا، مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقدِ مبارک پر حاضر ہوں گے، تو زندہ واپس نہ آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔" [1]

خط لکھنے میں انسان تصنع سے کام نہیں لیتا کہ ایسا کرنے سے خط لکھنے کا مقصد فوت ہوتا ہے اس لئے خطوط انسان کا ایسا ذاتی بیان ہوتے ہیں جو تصنع اور تکلف سے خالی اور صداقت کا آئینہ دار ہو۔ لہٰذا ان کے خطوط سے چند اقتباسات کا درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:-

۱۳ جون ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:-

آپ عاشقانِ رسولؐ میں سے ہیں اس واسطے ایک اور بات آپ کے گوش گزار کرنے کے لائق ہے۔ ۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا)

---

[1] اقبال بابتہ اکتوبر ۵۷ء ص ۳۰۔

میں نے سرسید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں کہ تم کب سے
جہاں آئے ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گذر گئی۔ فرمایا
حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت
کھل گئی۔ اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل نظم ہو گئی
ہے میری زبان پر جاری ہو گئے۔" [1]

ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو سیرت النبی کی
تکمیل پر لکھتے ہیں۔

آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ اس کا صلہ قوم کی طرف
سے شکر گزاری کی شکل میں مل رہا ہے اور دربار نبوی سے
نہ معلوم کس صورت میں عطا ہو گا۔" [2]

میر غلام بھیک نیرنگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا
ہے سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان
اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی
وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں،
دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی
انشاء اللہ تعالیٰ۔" [3]

ایک خط میں جو مخدوم مالک سید غلام میراں شاہ
کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کا اخلاص اور
محبت جو آپ کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے،

---

[1] مکاتیب اقبال صفحہ ۱۱۸ [2] مکاتیب اقبال ۱۱۲ [3] مکاتیب اقبال
صفحہ ۲۰۷ —

آپ کے خاندان پر بہت بڑی مصیبت کے نزول کا باعث ہوئی۔[1]

ایک دوسرے خط میں جو دسمبر ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا [illegible]

شاہ صاحب کو لکھتے ہیں:

الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور [illegible]

مصروف ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے [illegible]

کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریک حال ہوں۔ [illegible] کہ میں

بھی آپ کے ساتھ چل سکتا۔ اور آپ کی صحبت کی برکت

سے مستفیض ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی

باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضورؐ کے

روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضورؐ کے ارشاد سے جرأت

ہوتی ہے۔ [illegible] کہنا میرے لئے ہے۔ آپ

سے آپ [illegible] دربار میں پہنچ کر میرے فرموشی نہ کریں گے۔[2]

سید [illegible] بدایونی دسمبر ۱۹۳۳ء کے خط میں

تحریر فرماتے ہیں: آپ کی خیریت والسی بہ دل و جان

پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کا حج قبول

فرمائے اور آپ کو اپنے دین کی محبت اور اپنے حبیبؐ کے

عشق سے مالا مال فرمائے۔[3]

ایک خط میں جو فروری ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] مکاتیب اقبال صفحہ ۲۲۲۔ [2] مکاتیب اقبال صفحہ ۲۲۹

[3] مکاتیب اقبال صفحہ ۲۳۲۔

"فقہی مسائل کے اختلافات، زعمائے اسلام کی جبروت و قدرت، جیسی چیزیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عشق و شیدائی ہیں، ان تمام چیزوں کا مقابلہ بھی روحانی لذت رکھتا ہے۔"[1]

ان ہی چند حوالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اب ان کے تاثرات عشق رسولؐ کے آئینے میں دیکھئے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کے جذبات و واردات محبت کی جس صورت اگر کہیں نظر آتی ہے تو اسی آئینہ میں نظر آتی ہے اگرچہ عشق و محبت کے لیے مقامات بھی آئے ہیں جن کے بیان کرنے سے نثر بھی قاصر نظر آتا ہے۔

شوق اسرار خودی کی

اس عنوان کے تحت کہ "خودی از عشق و محبت استحکام می گیرد" لکھتے ہیں:

دست مشوقے نہاں اندر دلت — چشم اگر داری ببیا جمالیت
خوش تر و زیباتر و مہ تابتر — خوش تر و زیباتر و مہ تابتر
ذات او از خوبان خوب تر — خال ہم روشن ثریا نام شود
سالک بخارا ز فیض او جالاک شد — تو ندانی رز حرم و ہم افلاک شد
در دل مسلم مقام مصطفیٰ ست — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ست

یعنی مسلمان کے دل میں ایک معشوق پوشیدہ ہے۔ اگر چشم بینا ہو تو اس کے جمال کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ معشوق کیسا ہے؟ دنیا کے تمام حسینوں سے حسین تر و زیبا تر

---

[1] مکاتیب اقبال صفحہ ۴۰۴۔

اس کے عشق سے دل دھڑکتے (کروڑوں) ہونے کے لئے تڑپتے ہیں
اور خاک بھی بلند ہو کر رقم دہ شہر ثریا ہو جاتی ہے۔ [illegible]
فضل سے خاکِ عربستی ذات سے اُٹھ کر رفعتِ عزت و
اقبال کی انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ محبوب [illegible]
جو ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ مسلمان حضور کے نام پر مرتا
ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ میرا دل حضور کی محبت سے خالی نہیں ہے
مگر حضور کا اتباع کر کے صفاتِ نبوی کو اپنے دل میں جذب
کرے تو پھر اس کے حسن و جمال اور قوت و رفعت کا کیا ٹھکانہ
ہے! ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

اس کے بعد حضور سرورِ کائنات کی بعض خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں
کہ آپ نے مسکینوں اور غریبوں کی سی زندگی بسر کی۔ حد ہے کہ بوریا آپ کا
فرشِ خواب تھا۔ مگر اس نے ایسی بلند توحید پیدا کی جس نے تمام سر
کو اپنے پیروں تلے پامال کر دیا۔ غار میں آپ خلوت گزینی، زہد و قناعت اختیار
کی اس لئے کہ ایک زندہ قوم اور ایک نئے عالم پیدا کر دیا۔ رات کو آپ کی آنکھیں
محرومِ خواب رہیں اس لئے کہ قوم کو نیند و غفلت کا مالک بنا دیا۔ لڑائی کے وقت
آپ کی تلوار آہن گداز تھی تو نماز میں آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ نصرت
کی دعائیں آپ کا آئین کہنا تلوار کا کام کرتا تھا جو میدانِ کارزار میں
آپ کی تلوار نے سلاطین کا قلع قمع کر دیا تھا۔ آپ نے دنیا میں آئین لڑائیاں
لڑیں اور قوم کو ان سندوں کو مالک کر دیا۔ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ
کھول دیا۔ دین پر عمل پیرا کر کے ایک نہایت درجہ ترقی والی قوم کو دنیا کی امامت
اور بادشاہت کا مالک بنا دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس قوم دین کو دنیا کی کنجی قرار

دے دیا کہ دنیا کی سربلندی دین کی پابندی کے تابع ہے، آپؐ کی نگاہ میں پست و بلند ایک تھے۔ اپنے غلام کو اپنے دسترخوان پر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ کیا اس جیسا ابطحی کبھی دوسرا پیدا ہوا ہے؟

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ پیکار آں شہنشاہِ آگہ — دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین گفتہ — قاطعِ نسلِ ملاطین گفتہ
در جہاں آئینِ نو ایجاد کرد — مسندِ اقوامِ عالم در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خوان نشست

کیا آج خلوت گزینی، ترکِ دنیا، زہد و قناعت اور فقر و فاقہ اختیار کرنے والوں کے پیشِ نظر بھی یہی مقاصد ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو اتباعِ رسولؐ کا دعویٰ کس لئے!

ایک جنگ میں اُس خانہ بدوش سردار حاتم طائی کی لڑکی قید ہو کر آئی ہے یہ زنجیر، بے پردہ اور سر جھکائے ہوئے۔ حضورؐ نے لڑکی کو اس حال میں دیکھا تو اپنی چادرِ مبارک اس کے منہ پر ڈال دی۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ؎

مادراں خاتونِ خطے مُریاں تریم — پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست او — در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او
لطف و قہرِ او سراپا رحمتے — آں بیاراں، ایں باعدا رحمتے
آنکہ بر اعدا ز رحمت کشاد — مکہ را پیغامِ لا تثریب داد

قوم اختلاط افراد سے بنتی ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہم حضورؐ کی محبت سے ایک زندہ و پائندہ قوم ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹہنی پر برگ کی طرح، جس کی پتیاں ہزار مگر بو ایک ہوتی ہے۔ ہم بھی حضورؐ کی محبت کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک ہو گئے ہیں۔ اور اسی چیز نے امتیازات نسب سے بھی ہم کو پاک کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے رسالت مآبؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایسی ملت پیدا کی جو ہر قسم کے امتیازات سے پاک اور دنیا بھر میں منتشر و پراگندہ ہونے کے باوجود ایک ہے ؎

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم — چوں نگہ نوبرد و چشم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما — شبنمے یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحا ستیم — چوں نگہ نوبرد و چشم و یکیم
امتیازات نسب پاک سوخت — آتش و این خس و خاشاک سوخت
چوں گل صد برگ ما را بوئے ست — او ست جاں این نظام را و یکے ست

سنجر مکنوں دل او ما بدیم
نعرہ بیباکانہ زد افشا شدیم

سوزِ خودی

وہی خیال جو اسرارِ خودی میں افراد کے متحد ہو کر ایک قوم بننے کے بیان میں ظاہر کیا تھا، یہاں ملت کی تعریف کے ضمن میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

حق تعالےٰ را بیکے ما آفرید — وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرف با صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما — از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزو ما از جزو ما بیشک است

آنکه شانِ اوست یُهدیٰ مَن یَّشَاء — از رسالت حلقۂ گردِ ما کشید
حلقۂ ملّت محیط افزاستے — مرکزِ او دادِ بالطّی ہاستے
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
از میانِ بحرِ او خیزیم ما — مثلِ موج از ہم نمی ستیزیم
آشنائی در حریمِ دلبرِ ما — نعره زن، شیرِ شکاراں در آجم

قلبِ مومن را کتابش قوّت است — حکمتش جز الزامِ ملّت است
فرد از حقِ ملّت از وے زندہ است — از شعاعِ مہر او تابندہ است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود — پختہ چوں وحدت شود ملّت شود
زندہ ہر کثرت از ہنگامۂ وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم
این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — تا کہ یکدیم از احسانِ اوست
تا ز این وحدت ز دستِ ما رود — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم، ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گزاشت — دادِ ما را آخرین جامے گزاشت
"لا نبی بعدی" را احسانِ خداست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است

قوم را سرمایۂ وحدت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو

اس بات کو کہ ملّتِ محمدیہؐ کسی خاص جگہ کے لئے نہیں ہے بلکہ سارے عالم کے لئے ہے۔ حضورؐ کی سیرت پاک کے آئینے میں اس طرح دکھلائے

ہیں ؎

(۱) بہترین پیغمبرے چو کعبۂ پاک نژاد — بردہ آورد از بانت سعاد
ورثنا اش گوہر شب تابہ شفت — سیف مسلول ز سیوفِ ہند رفت
آن مقامش بر ترا و چرخ بلند — ذاتِ شمس انسبت بہ قلب سمند
گفت سیفٌ من سیوف اللہ گو — حق پرستی چیز بر احمق مبر

حضرت کعبؓ نے حضورؐ کی مدح میں قصیدہ سنایا تھا "بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے۔ قصیدہ میں حضورؐ کو ایک جگہ "سیفٌ من سیوف اللہ" کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ حضورؐ نے اس تخصیص مقام کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "سیفٌ من سیوف اللہ" کہنا چاہیے۔

دلبرا ہمچناں آں نازنین جزو تو کل — رو بپائش سر نہ ہر رسل
گفت با آں دلربا صحبت شما — رو نہ دارم نعت تعظیم ترا
گر ترا ذوقِ معانی رہنما است — سنۂ پوشیدہ در صرف خدا است
یک ز آں شمع شبستانِ وجود — بود در دنیا و در دنیا نبود
جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز — بود از نور ما بسوکل آمدہ ہنوز
سر پیدا نم مرز بود ہم او کجاست — ایں قدر دانم کہ با ما آشناست
ایں مقام را جہاں یا شمرد — حوصلہ را سیہاں یا شمرد
زانکہ ما را سینۂ جاں گم کردہ ایم — قوتِ را در رخ کہاں گم کردہ ایم
مسلم است ایں ہا قلیلے بیش نیست — گر ستوانند در جہاں چوں و چند
ز آنچہ مسلم اندر مردم بوم — در رسل از دیا زہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در بنیاد دل — نی شود کم ایں سرائے آب و گل

حضورؐ نے فرمایا ہے "حُبِّب الیّ من دنیاکم ثلاث الطیب و جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"

[illegible] تمہاری دنیا میں [illegible] اور خوشبو کو دوست رکھتا ہوں۔ اور نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تم ذوقِ معانی رکھتے ہو تو حرفِ "شعاع" میں نکتہ چھپا ہوا ہے وہ یہ کہ وہ شخص شبستان وجود میں [illegible] ہوئے دنیا سے الگ تھا۔

آدم ابھی آب و گل میں تھے کہ وہ محبوبِ قدسیاں بنا ہوا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہم سے بخوبی واقف ہے۔ جب ہی تو اس نے عاصم کو ہمارا جہان اور اپنے آپ کو ہمارا مہمان کہا ہے۔ اس لئے ہمارا سینہ دل سے خالی ہے اور ہم اس خاکدان میں کم ہو چکے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ تم مسلمان ہو ملک و وطن سے دل نہ لگاؤ۔ یعنی اس جہان میں زندگی چند روزہ ہے گم نہ ہو جاؤ۔ مسلمان ملک و وطن میں گم نہیں ہوتا۔ بلکہ شام و روم (ملک و وطن) اس کے دل میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تم ایسا دل پیدا کرو جس میں یہ سرائے آب و گل گم ہو جائے۔

[illegible]	از وطن آوارۂ ما ہجرت نمود
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
آنکہ در قرآں خدا او را ستود	آنکہ حفظِ جانِ او موجود بود
[illegible]	لرزہ بر تن از شکوہ و سطوتش
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

آقائے دو عالم نے وطن سے ہجرت فرما کر قومیت مسلم کا مطالبہ واضح کیا ہے۔ آپ کی حکمت نے وطن کی بجائے، کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک نئی ملت تعمیر کی ہے۔ اور اس طرح اُس سلطان دین کی بخشش سے تمام زمین ہماری مسجد ہو گئی ہے۔

وہ کہ خدا نے جس کی تعریف قرآن کریم میں کی ہے، جس کو حفاظت نے ذلّت دیا۔ جس کی ہیبت سے دشمن بے بس و مجبور، جس نے شکوہِ نصرت سے "ایدہ بجنود لم تروھا" نے آبائی وطن سے کیوں ہجرت کی؟ کیا تم یہ کہتے ہو کہ وہ دشمنوں سے ڈر کر بھاگا؟ فتنہ گوؤں نے حق کو چھپایا ہے۔ ہجرت کے معنی غلط سمجھے ہیں۔ ہجرت تو مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ اور اسی سے ثبات و بقا کا باعث۔ اس کے معنی کم فہمی و کم حوصلگی کی وجہ سے بھاگنے کے لئے ہیں۔ ورنہ شبنم کو سمندر کی خاطر ترک کیا گیا ہے۔ اس لئے اے مسلمان بھول، محدود وطنیت کو چھوڑ دے کہ تیرا مقصود کلستان دنیا گیر اخوت ہے اور اس بظاہر نقصان میں ہی تیرے فائدے پوشیدہ ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "اسی سلسلے میں ڈاکٹر اقبال نے اس شبہ و اعتراض کا جواب دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت دشمنوں سے ایک فرار کی صورت تھی اور اس قسم کی ہزیمت ایک اولوالعزم پیغمبر کے شایانِ شان نہیں۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ بزدلی نہیں بلکہ جرأت و ہمت تھی۔ اور ہجرت جہاد کا مقدمہ و اعلان تھی۔ لیکن ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ایک ایسی عالمگیر ملت کا پیدا کرنا تھا جو وطنیت کی قید سے آزاد ہو۔ اس لئے آپ نے مکہ سے نکل کر مدینہ میں اس قسم کی قومیت کی اور وطنیت کا خاتمہ کر دیا۔

جوہر ما با مقامِ بستہ نیست

مادۂ منزل ہمہ ما دربستہ نیست [1]

[illegible] کہ "ملتِ محمدیہ نہایت زمانی [illegible] کے لئے [illegible] کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ:

زانکہ ما را فطرت ابراہیمی است
ہم بہ منزل بستہ ابراہیمی است

خواجۂ [illegible] کو سیرتِ ملیہ کی پختگی آئینِ الٰہی کے اتباع پر موقوف ہے

اس لئے کہ ؎

شاہد آئین حق سرخوب و زشت
بہر تو بس نسخۂ قدرت نوشت

رنگ و نسب [illegible] سازدت
جامۂ تقدیر در اندازدت

خضرِ راہ [illegible] منزلت
پختہ منزل کوہساران [illegible]

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ ثبات

گر ز حق [illegible] سازد ترا
آنچہ می خواہد ازو سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را
[illegible] آہن را بلرزد سنگ را

تا شعارِ مصطفیٰ از دست رفت
قوم را از حیات از دست رفت

آن [illegible] سربلند و استوار
مسلمِ صحرا نوردِ شعر سوار

[illegible] در وادیِ بطحا گرفت
تربیت از گرمیِ صحرا گرفت

[illegible] چنان کاہیدہ از بادِ سموم
[illegible] گردیدہ از بادِ سموم

---

[1] مقالاتِ یومِ اقبال صفحہ ۱۲ ۔

آئینِ الٰہی کی تعریف کرتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے اچھے کو برے و زشت کو جانتا ہے، مسلمان کے لئے یہ نسخہ قوت و توانائی کا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے آدمی آہنِ صلب (نہایت قوی) اور دنیا میں بہتر مقام پر فائز ہوتا ہے۔ یہ خستہ کو پہاڑ کی طرح پختہ و استوار کرتا ہے۔ دینِ متین پر عمل پیرا ہونے سے زندگی اور ضابطہ کی پابندی حاصل ہوتی ہے اگر زمین پست (پست) ہے تو یہ اسکو آسمان (بلند) بناتا ہے۔ بلکہ ایسا بناتا ہے جیسا خدا چاہتا ہے کہ وہ بنے۔ یہ صیقل ہے کہ زنگ کو صاف کر کے انسان کو آئینے کی مثال بنا دیتا ہے۔

قوم نے جب سے شعارِ مصطفیٰؐ کو چھوڑا ہے، زندگی سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ بنا بلند و استوار یعنی شتر سوار صحرائی مسلمان جب تک وادی بطحا میں رہا، گرمیٔ صحرا سے تربیت حاصل کرتا رہا۔ مگر جب سے عجم میں آیا اور عجمی تصورات سے متاثر ہوا ہے۔ اس کی قوت میں زوال ہی آتا چلا گیا۔ اور اب اس کی ناتوانی کی کوئی حد نہیں ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

شیخ احمد سرہندی جنابہ — تا سبب نور از ضمیرش آفتاب
گل کرمی خیزد مزار پاک او — لالہ گویا ای دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جانِ پدر — از خیالاتِ عجم باید حذر
راہ فقرش گرچہ زگردوں گذشت — از صدِ دینِ نبیؐ بیروں نہ گشت

اس سلسلے میں کہ "حسنِ سیرتِ ملی" آدابِ محمدیؐ کے ساتھ اپنے آپ کو مؤدب بنانے میں ہے، اپنے والدِ مرحوم کی زبان سے فرماتے ہیں۔ والد نے جوانی میں ایک موقعہ پر نصیحت کی تھی کہ ؎

آنکہ بیتابد ز سرِ المنتقش دو نیم — رحمت، دعا و اخلاقش عظیم

از مقام، دائر و دوراں ایستی — از میاں ایں معشر ما ایستی

ملت پاک مسلماں گوہر است — آب و تابش از نم پیغمبر است

آب بیسانی ز آئینش دراں — در زمیں ان قطرہ مشکیں گوہر است

در جہاں روشن تر از خورشید شو — طالب تابانی جاوید شو

اس سلسلے میں کہ "حقیقی جمعیت نصب العین کے مضبوط تعاون سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور اُمتِ مسلمہ کا نصب العین حفظ و نشرِ توحید ہے اور بس" فرماتے ہیں ؎

اُمتے پاک از ہوی گفتار او — شرح رمز ما خوی گفتار او

تا بدست آرد زِ نبضِ کائنات — دائمودا سرِ تقویمِ حیات

از قبائے لالہ ہائے ایں چمن — پاک شو ز آلودگی ہائے کہن

در جہاں وابستۂ دینش حیات — نیست ممکن جز بآئینش حیات

در کلی زاری کتابش در بغل — تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل

اس کے بعد فرماتے ہیں "فکر انسانی اجوبت کردہ بت پرست واقع ہوئی ہے اور ہر وقت ایک نئے بُت کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس نے بے راہ روی شروع کی ہے اور ایک نیا بُت بنایا ہے۔ ایسا بُت کہ جس کو خون ریزی میں مزا آتا ہے۔ اس بُت کا نام رنگ، نسب اور ملک ہے۔ اس نابکار بُت کے قدموں پر آدمیت کو بھیڑ بکری کی طرح قربان کر دیا گیا ہے۔ اے مسلمان! تو نے مینائے خلیلؑ سے شراب پی ہے اس لئے تیرے خون میں بیباکیٔ خلیلؑ کی گرمی ہے۔ اس حق کے لباس میں چھپے ہوئے باطل کو بھی لا موجود الا اللہ کی تلوار سے ہلاک کر دے۔ تاکہ یہ تاریکی دور ہو۔ اور دنیا پھر توحید اور احترامِ آدمیت کے نور سے منور ہو جائے۔ غرضکہ جو چیز تجھ پر نازل ہوئی ہے اس کو عام یعنی دنیا کو نعمتِ اسلام سے

بہرہ ور کردے۔ ورنہ ؎

لرزم از نرم تو چوں برگ شجر — پُر سعادت آں بر و بُر خوردار

سرِ ایماں از حضرتِ ما بردہ — پس چرا باد بگرداں تست

اس بیان میں کہ "تو سبع حیات ملی نظام عالم کی قوتوں کا مرکز ہے"

پیر رومی فرماتے ہیں ؎

آنکہ از زہرِ قہر سیاں را سیہ حست — اوّل آدم را سرِ فتراک جست

محمدؐ نفوس را اوّل کشود — ہمت از تسخیر موجودات اندود

بقائے نوع، اُنسِ ذات (عورت) کی وجہ سے ہے اور حفظِ ذات، اخوت

اخوت جس اسلام ہے چنانچہ اقبالؒ حضرت نبی کریمؐ کے محل سے مخاطب

کرتے ہیں کہ ؎

آنکہ از وجودش کائنات — ذکرِ او فرمود را طیب و طہٰ

بہرہ از حکمت قرآں بردہ — بیکسے کو را پرستار رسد

زانکہ او را با خودی نسبت است — یک ز بنی ہمسر و ہمت است

سیرتِ اقوام را محفوظ کرد — شعشعہ اش شفقہ پیدا ست

حرفِ اُمت نکتہ ہا دارد لبے — ہست اگر فرہنگ او معنی رسے

نو بہاراں اُمہات آں جہاں — گفت پیغمبر حرفِ کُن فکاں

ورنہ دارد زندگی خام است و بس — ملت اندر کعبہ ارحام است و بس

یہ شعر جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس سے پہلے گزر

چکا ہے۔ پہلے شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

اُمہات تحت اقدامہا تکم (یا تحت اقدام اُمہات)

جنت تمہاری ماؤں کے قدموں میں ہے۔

اسی تشریح قرآن کریم کے اس ارشاد کی ترجمانی ہے۔ کہ فرمایا

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ وَلِلّٰهِ بِهٖ اَنْ يَّوْصَلَ وَيُفْصَلَ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؕ

جو لوگ صلۂ رحمی کو قطع کرتے ہیں یعنی اللہ نے جس رشتے کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے توڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں وہ خسارہ میں رہنے والے ہیں۔ ان وجوہ سے اقبالؔ کا یہ کہنا درست ہے کہ جو مسلمان عورت کو ذلیل سمجھتا ہے وہ قرآن مجید کی تعلیمات سے بہرہ ور نہیں ہے۔ ؎

مُلّے کو ہے پرستارِ بے شعور
بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد

حضورؐ نے جو عورت کی تعریف کی ہے اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عورت کو بجائے کنیز و خادمہ سمجھنے کے اس کا احترام کیا جائے کہ نظامِ ملّت اور حسن و معاشرت کے لئے اس کی ضرورت ہے، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ عورت بھی... فرمودۂ سرورِ کونینؐ پر ناز کرتے ہوئے اپنے مقام کو پہچانے اور معاشرہ کے حق میں فساد کا باعث بن کر اپنے آپ کو ذلیل و خوار نہ کرے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں گاؤں کی وہ جاہل، پست قامت، موٹی، بدصورت، غیر مہذب، ناتربیت یافتہ کم عقل، کم گو اور سادہ لڑکی جس کا آلام نسوانی سے دل خون ہو گیا ہے اور جس کی آنکھوں کے گرد نیلے حلقے پڑ گئے ہیں۔ اگر ملّت کو اس کی آغوش سے ایک مسلمان غیور و حق پرست فرزند ملتا ہے تو ہماری ہستی اس کے آلام سے محکم اور ہماری صبح اس کی شام سے عالم افروز ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ نوآغوش، نازک پیکر، جس کی نگاہ صیاد کی قیامت بھی خانہ بدر و، جس کی فکر عقرب کی روشنی سے منوّر، جس کا ظاہر زرّیں، اور باطن نازک ہے، جس نے ملّتِ بیضا کی آہنی پابندیوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے جس کی آنکھوں سے عشوہ و ناز حل ہو کر بہہ رہا ہے، جس کی آزادی گستاخ، فتنہ زا اور حیا سے ناآشنا ہے، جس کا حلم یا رامومت کا متحمل نہ ہو سکا اس سبب سے اس کی شام میں

ایک ستارہ کبھی نہ چمکا آغوش اولاد سے خالی رہی، ایسا پھول خلد کرے جہاں باغ ہی نہ اُگے اور اُس کا داغ ملت کی پیشانی سے دُور رہے۔ یعنی ایسی لڑکی سنتِ اسلامیہ کو نہیں چاہیئے۔ کہ اس کا وجود اسلام کی پیشانی کے لئے بدنما داغ ہے۔

"عرضِ حال بحضور رحمۃ اللعالمینؐ" بھی سُن لیجئے!۔

اے ظہور تو شتابِ زندگی — جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی
از تو بالا پایہ ہیں کائنات — فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی
بے تو زنا بود مندِ ہیا نجلی — پیکرِ ایں سرائے آب و گل
تا دمِ تو آتشے از گل کشود — تودہ ہائے خاک را آدم نمود
ذرّہ دامن گیرِ مہر و ماہ شد — یعنی از نیروے خود آگاہ شد

بلکہ عرضِ حال میں تو اپنی محبت کی ابتدا اور انتہا بھی بیان کر دی ہے اور اپنا مقصدِ حیات بھی ظاہر کر دیا ہے۔ ؎

تا مرا افتادہ بر رویت نظر — از آبِ دام گشتۂ محبوب تر
عشق در من آتشے افروخت است — فرصتش ہا دا کہ جانم سوخت است

اے تعبیری را رہا بخشند ہ — بر ربط سلما مرا بخشند ہ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را — ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینۂ بے جوہر است — در بحرفم غیر قرآن مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصارِ دہور — چشمِ تو بینندۂ مافی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

در دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ اند | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایں ز احسانِ تو بالائے سر است | یک عنایت مُزد گفتارم بس است
عرضہا کن پیشِ خدا عز و جل | تا شفیعِ من گردد آں شہِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ | بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیساں گہر گرداں مرا!

رخت جاں تار و رباب آوردہ ام | سوزِ ساز دیگر سے پروردہ ام
نغمہ ہا در سینۂ ام آسودہ است | نغمہ از تارِ حیاتم زدہ است
در دلم آتش ز آہِ سرد افروختم | آتش از آہِ سرد افروختم
تا فلک در سینہ ام سازد مرا | در قرارِ زندگی باندد مرا
آرزوئے من جواں تر می شود | ایں کہن دیبا کہ اں تر می شود
ایں نمد زیرِ خاکم گوہر است | در شبِ تاریک ایں یک اختر است

اس کے بعد اپنی سرگذشتِ زندگی بیان کرتے ہیں کہ ایک دور وہ آیا کہ میں ایک مدت۔ کہ خوبصورتیوں کے عشق میں گرفتار رہا۔ چراغِ عافیت کو گل کرنے والے حیاتِ دل کے ساتھ شغل سے اجتناب کیا۔ میرے حاصل کے گرد بجلیاں رقص کرتی تھیں اور میری متاعِ دل کو رہزن چراتے تھے۔ مگر یہ شراب اور نرد میرے پیمانے سے نہیں چھلکی اور یہ زرِ ناب میرے دامن سے نہیں گزرا۔ دوسرا دور وہ آیا جب عقلِ آذر پیشہ نے میرے گلے میں زنار ڈال اور اس کا نقش میرے کنزِ رحماں میں بیٹھ گیا۔ سالہا سال خشک میرے دماغ خشک کا جزو دل بنفک رہا۔ علم الیقین کا ایک حرف نہیں پڑھا۔ گلاں آہِ حکمت میں رہتا تھا۔ میری ظلمتِ تاب حق سے اور میری شام نورِ شفق سے بیگانہ

کاش یہ تمنا میرے دل میں اسی طرح پوشیدہ رہتی جس طرح موتی صدف میں رہتا ہے۔ آخر میرے پیمانۂ چشم سے ٹپک گئی اور اس نے میرے ضمیر میں خلش پیدا کر دیئے۔ اس کے بعد اظہار تمنا کرتے ہیں۔ مگر اظہار کا انداز دیکھئے:- ؎

اے ز یادِ خیبر تو جانم تہی — بر لبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی را از عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار می آید مرا — شفقت تو جرأت افزاید مرا
جستہ شانِ رحمت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز

پھر عرض کرتے ہیں کہ وہ مسلمان جو ما سوی اللہ سے بیگانہ ہے۔ بتخانہ کا زنّاری کب تک رہے! بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب اس کا وقت آئے تو اس کے جسدِ خاکی کو دیر (ہندوستان) اپنی آغوش میں لے اگر میرے اجزائے تن قیامت کے دن آپ کے در سے (زندہ ہو کر) اٹھیں تو جہانِ امروز قابلِ صد افسوس ہے وہاں فردا تنہا ہی زیادہ اچھا ہے سو جائے گا جس شہر میں آپ رہتے ہیں۔ کتنا اچھا شہر ہے! جس خاک میں آپ آرام فرما ہیں کیسی اچھی خاک ہے! ؎

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من — پیشِ عاشق ایں بود حبّ الوطن
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم، انجامم نگر

پیامِ مشرق

جام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے امان اللہ خاں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

سبزۂ گل صاحبِ اُمّ الکتاب — بر زگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید — مرتبِ مردی از زبانِ او چکید

"خطاب بہ اعلیٰحضرت کمال پاشا" والی نظم میں لکھتے ہیں ؎

آنچہ بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او — واقف از سرِ نہانخانۂ تقدیر شدیم
سہل مائید۔ شرر باختہ سنگ بودہ است — نظرے کرد کہ خورشیدِ جہانتاب شدیم

بانگِ درا

پیامِ مشرق کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی مگر اُس میں اقبال کا ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کا کلام ہے۔ ہم ابتدائی دور کو چھوڑ کر ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام کو دیکھتے ہیں جب کہ وہ یورپ سے تعلیم پا کر واپس آ گئے تھے۔ تاکہ فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کلام سے بھی اُن کے عشقِ رسولؐ کا حال معلوم ہو۔ اس جائزے میں سب سے پہلے ہمارے سامنے اُن کی نظم "بلادِ اسلامیہ" آتی ہے جس میں زود دلی سے شروع ہو کر بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کو اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے بعد مدینۃ النبیؐ سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰؐ — دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر کے روا
خاتمِ ہستی میں تو تابانی ہے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی دلالت گاہ ہے تیری زمیں

تجدید ارادت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اطاعت اقوامِ عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشین قیصر و وارث مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قوت اسلام پابندِ مقام
مدعی ہیں جاں اس کی فارس پختہ کار

ہے شہر یثرب اس صلعم کا تو مادی ہے تو
نقلِ جاں ہے تاثر لی شعاعوں کا ہے تو

جب تک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے آدا کہ چمن میں گر شبنم بھی ہیں

"ایک حاجی مدینہ کے راستہ میں" والی نظم میں حاجی کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

خوف کہتا ہے کہ شہر یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ لو سلم ہے بیباکانہ چل

لے زیارت کر جیتا اللہ پھر جاؤں گا کہاں
عاشقوں کو دیر تک مغموم نہ دکھلاؤں گا کہاں

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ بشت پیکاں جاں
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی خوفی ہے راز

گو سلامت محفلِ شاہِ ابا کی ہے جہاں
عشق کی لذت نہ ہو تو زندگی جاں کا ہی ہے

اس کے بعد نظم "حضور رسالت مآب" میں پڑھیے۔ شاعر تصور کے بے دل سے اڑ کر فرشتوں کے ہمراہ حضور رسالت مآب میں پہنچ جاتا ہے۔ حضور دریافت فرماتے ہیں ؎

نکل کے باغِ جہاں سے ہر تنگ آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کر آیا!

شاعر عرض کرتا ہے ؎

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی!

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلک رہی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

جواب شکوہ میں لکھتے ہیں ؎

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو تم بھی نہ ہو — بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے — بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیاباں میں ہے — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے!
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ بلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں آنکھ کے تارے کی طرح

ابوطالب کلیم کے شعر کو تضمین کرتے ہیں ؎

خوب ہے تجھ کو شعار صاحب تیرا پاس ہے! — کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں!
جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں تھا گردوں اسیر — اے مسلماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

یعنی حضورؐ کا اتباع دنیا میں سربلندی اور کامرانی کا باعث تھا۔ جب سے اتباع کی جگہ نافرمانی شروع کی ہے آسمان رفعت سے خاک ذلت پر گرا ہے۔ اگر عزت و اقبال کی تمنا ہے تو پھر حضورؐ کے اتباع کو اپنا شعار بنانا ہوگا ؎

غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر — نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں
سرکشی باہر کہ کردی رام او ناید شدن — شعلہ سان از ہر کجا بر داشتی آنجا نشیں

"صدیق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ یہ نظم صحابہ رسولؐ کی پروانہ وار محبت کا بیان بھی ہے کہ یہ حضرات حضورؐ کے مقابلے میں کسی چیز کو بھی عزیز نہیں رکھتے

تھے نیز اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی تعلیم نے لوگوں کے قلوب و اذہان کو ایسا متاثر کیا تھا اور ان میں کیسی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کر دی تھی کہ ہر فرد کا ایک ہی مقصدِ حیات بن گیا تھا۔ جس کے حصول کے لیے وہ قربانی، ایثار اور تسلیم و رضا کے لئے دوسرے سے آگے نکل جانے میں یکساں کوشش کرتا تھا اس کے ساتھ ہی نظم کا ایک ایک لفظ خود اقبال کی محبت رسولؐ کا آئینہ دار بھی ہے۔ ؎

ایک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
دیں ہاں راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار

ارشاد سن کے فرطِ طرب میں عمرؓ اٹھے
اُس روز اُن پاس تھے درہم کئی ہزار

دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

لائے غرض رسولِ امیں کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار

پوچھا حضورِ سرورِ عالم نے اے عمرؓ!
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار!

رکھ، ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
شامل ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملکِ صفا بہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپ، قمر، سم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضورؐ! چاہئے فکرِ عیال بھی!
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

حضرت بلالؓ جو نسلاً حبشی تھے۔ اور اسلام لانے سے پہلے غلام بھی تھے۔ عاشقانِ رسولؐ کی صفِ اوّل میں ہیں اور حضورؐ کے عشق کا صدقہ

ہے کہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یوں تو ہر عاشق رسولؐ زندہ جاوید ہے۔ مگر یہ کس چیز کے ساتھ زندہ ہیں؟ اذان کے ساتھ، جس کے بادشاہ و فقیر سب محکوم ہیں۔ جو رنگ و نسل اور ملک و وطن کے امتیازات کو مٹا کر غریب و امیر کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ جس سے مسلمان کے دل میں ایمان کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور جس کو فلک پر صدیوں سے اسی طرح سن رہا ہے۔

اس کے برعکس سکندر رومی، جس نے ایک دنیا کو فتح کیا۔ اور جس کی کثرت افواج اور دبدبہ و شکوہ سے دنیا لرزہ براندام تھی۔ آج تاریخ میں نشتہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ایک نظم میں جس کا نام ... "بلال" ہے اس طرح بیان کیا ہے ؎

لکھا ہے ایک مشرقی حق شناس نے
جو لاں گہ سکندر رومی تھا ایشیا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ داں بھی اُسے پہچانتا نہیں

اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
دعوی کیا جو پولس دارا نے خام تھا
حیرت سے دیکھتا فلک نیلی فام تھا

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
جس کا اسیر ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز

نعرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر
محکوم اس کے آگے ہیں شاہ و فقیر
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

ایک غزل کا شعر ہے ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم!
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

یعنی حضور اکرمؐ نے خود شناس انسان کو کیسا خود شناس بنا دیا کہ باطل
بتکدہ کجا ست تک کی پرستش کرتا تھا اسلام کا کلمہ پڑھتے ہی اس کا دماغ
ایسا افلاک پر پہنچا کہ اب اس کا سر خدا کے سوا اور کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اس
لئے شاعر نے حضور ہی سے درخواست کرم کرتا ہے کہ یہ دماغ سکندری حضور ہی کا
عطا کیا ہوا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکوں کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور اُن کو معلوم
ہوتا ہے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون۔ نیز ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے
ترکوں کو آزاد کرایا اور برطانوی فوجیں قسطنطنیہ سے پسپا ہوئیں۔ تو دنیائے
اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور کسی قدر بیداری کے آثار بھی پیدا ہو گئے
تو اقبال بے حد خوش ہیں اور اس خوشی کے نشے میں سرشار ہو کر نظم "طلوع
اسلام" لکھتے ہیں۔ اور فرط مسرت میں آخری بند فارسی میں لکھ دیتے
ہیں۔ یہ فرمان اسلامی ممالک میں کم و بیش ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نیز
دلولہ شوق و جوش دل کی ترجمانی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ کرتی
ہے۔ مگر اس انتہائی خوشی کی حالت میں بھی معاً خیال آ جاتا ہے کہ یہ
سب کس کی جوتیوں کا صدقہ ہے؟ اُسی کا جس نے بدر و حنین کی
جنگوں میں شہ پکڑ کر خود جہاد کیا اور اس طرح قوم کو سربکف ہو کر
اسلام کے لئے جہاد کرنے کی تعلیم دی۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

بمشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکارا آمد

ایک غزل کا شعر ہے ؎

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو یہ پیغام مرا
تجھ سے بچھڑ کر اُمت کے اب دن بھی گئے دنیا بھی گئی

یعنی جس کملی والے نے مسلمانوں کو دنیا و دین کی سربلندیوں سے ہمکنار کیا تھا۔ آج جب کہ قوم اس کا راستہ چھوڑ کر کہیں کی نہ رہی تو ایسے وقت میں پھر اُسی کی یاد آ رہی ہے۔ اس لئے کہ مصیبت میں انسان اسی کو یاد کرتا ہے۔ جو سب سے زیادہ شفیق اور مہربان ہو۔

لاہور کا جنم (گلشنِ راز جدید)

جہاں جبر و قدر کی بحث آئی، فرماتے ہیں ؎

بخیں فرمودۂ سامانِ بدر است
کہ ایمان در میانِ جبر و قدر است

فلسفہ کی بحث ہے خود بھی فلسفی ہیں۔ مگر جبر و قدر کے نظریات کی مضرت رسانی کو خوب جانتے ہیں اس لئے جب ان نظریات کی فتنہ سامانی سامنے آتی ہے تو معاً اسی دانائے کل کا ارشادِ گرامی یاد آ جاتا ہے جس نے زندگی کے کسی راستے میں ہدایت و رہنمائی سے محروم نہیں رکھا ہے۔ بدر بھی ہیں کہ ارشادِ والا یاد آتا ہے کہ بدر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جہاں اس ارشاد کو عملی صورت میں دیکھ لیا گیا تھا۔ کہ ۳۱۳ بے وسیلہ نفوس کی قلیل جماعت جہاں انتہائی معمولی سامانِ جنگ اور ٹوٹے پھوٹے اسلحہ سے جنگ کی تیاری میں پورے عزم و حوصلے اور ولولے کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہاں کامیابی کی تمام امیدیں خدا ہی کی ذات سے وابستہ کئے ہوئے اُسی کی طرف متوجہ اور دست بدعا بھی ہے۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ لَا یُغِلُّ عَلَیْھِنَّ قَلْبُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰہِ وَالنُّصْحُ لِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْقَدْرِ یَجْمَعُ دَعْوَتَھُمْ (حدیث حسن)

حضرت ابنِ عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کا اسلام میں حصہ نہیں۔ مرجئہ اور قدریہ (یہ حدیث حسن ہے)

مرجئہ:۔ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بندوں کے تمام اعمال قدرتِ الٰہی پر موقوف ہیں۔ بندوں کا ان میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس مذہب کے تحت مومن کی معصیت اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی جب کہ کفر کی حالت میں اطاعت کوئی نفع نہیں بخشتی۔

قدریہ:۔ قدر کا انکار کرتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ بندوں کے افعال خود ان کی قدرت پر موقوف ہیں قدرتِ الٰہی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ نہ اس کے ارادے کا کوئی حق ہے۔

چار یار نامہ

مولانا رومؒ کی زبان سے اسرارِ معراج بیان کرتے ہیں ؎

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
بیش و کم از ہمان آستوار — نیستی و قائم چوں خدا خود را شمار
ہر دو عالم در نظر با صفات — مصطفیٰ را فنی نہ شد الا بذات
چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے — امتحانے رو بروئے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ او — زندگی مارا چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار — در بماند ہست او کامل عیار

چیست تن؟ یا رنگ و بو خو کردن است — با مقام چار خو کردن است
از شعور است این کہ گوئی نزد و دور — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق — وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

این بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

زوروان، جو روح مکان و زمان ہے، اپنی تعریف کرتا ہے کہ ؎

آدمِ فرشتہ در بندِ من است — عالمِ شش روزہ فرزندِ من است
ہر گلے کز شاخِ می چینی منم — آدمِ ہر چیزے کہ می بینی منم
در طلسمِ من اسیر است این جہان — از دمم ہر لحظہ پیر است این جہان
"لی مع اللہ" ہر کرا در دل نشست — آں تو اے مردِ طلسمِ من شکست
گر تو خواہی من نباشم در جہاں — "لی مع اللہ" باز خواں از بیں جہاں

زندہ رود رومی سے پیغمبرؐ کی تعریف پوچھتا ہے۔ رومی جواب دیتے ہیں ؎

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست — عصرہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت — ما ہمہ مانندِ حاصل او چو کشت
پاک ساز و استخوان و ریشہ را — بال جبریلے دہد اندیشہ را
ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات — از لبِ او انجم آورد ناز سات
آفتابش را زوالے نیست نیست! — منکرِ او را کمالے نیست نیست!
رحمتِ او صحبتِ احرار او — قہرِ یزداں ضربتِ کرار او
گرچہ باشی عقلِ کل از دے مرم — زانکہ او بیند تن و جاں را بہم

حضورؐ کی تعریف کس کس پیرایہ میں اور کس جوش کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور تعریف کیا کرتے ہیں۔ حضور کی ایک بات پر دل و جان قربان جاتے ہیں۔ جس ادا کو دیکھتے ہیں دل ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جس شان پر نگاہ پڑتی ہے جان نذر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اسی پر بھی تعریف کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں فرق نہیں آنے پاتا۔ نہ افراط ہے نہ

تعریف بلکہ وہی اعتقاد ان شروع سے آخر تک قائم ہے۔ اور واقعیت ہر جگہ موجود ہے۔ اور اس کے خلاف ہونا بھی کس طرح جب کہ یہ احساس رکھتے ہیں کہ

از تنگ جامۂ ما بیکمر نہ سوا گردید
شیشۂ گیر و حکیما نہ بیا شام نہ رود

یثرب میں پہنچتے ہیں تو وہاں نبوت کی جلوہ گاہیں دیکھتے ہیں۔ طائف میں محمد ﷺ پر ابوجہل کعبہ میں نوحہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا نوحہ اقبال کی زبان سے سنئے ؎

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ
از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از بلالؓ قبر و کسریٰ سرد دود
نور جان ما ز دست ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است
این دو حرف لا الٰہ خود کافری است
تا بیاد دین آبا در نورد
با خداوندان ما کرد آنچہ کرد
باش تا از ضربتش لات و منات
انتقام از دست ما گیرند ہات!
دل ز غائب بست و از حاضر گسست
نقش حاضر را ز دل او شکست
ناصبہ او را ز طرح ملک و دین
از قریش و منکر از فضل عرب!
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خوان نشست!
قدر احرار و عرب نشناختہ
با کلفتان حبش در ساختہ
اشتران ما سواران آمختند
آبروئے دودمانے ریختند!
ایں ہمہ از ایں مواخات عجمی است
خوب می دانم کہ سلمان عجمی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است
رست خیزے بر عرب آوردہ است!
عزت ہاشم ز خود مہجور گشت
نزد ما رکعت چشم شان بے نور گشت
اعجمی را اصل عدنانی کجا است
لنگ را گفتار سبحانی کجا است!
چشم حاسدان عرب گردید کور
بر نیائی اے ز صہرا از خاک گور!

اے تو را اندر یمن صحرا دلیل
بشکن افسون ترا اے جبرئیل

بانگ زن اے سنگِ اسود باز گو — آنچہ دیدی از محمدؐ باز گو
اے ہبل اے نارہ پیروزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
ہمتِ شاں را مگر گیراں کن مسیل — تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل
صرصرے زد یا ہوائے بادیہ — انہدم اعجاز نخلِ خادیہ
اے مناتِ لات ازیں منزل مرو — گر نہ منزل میروی از دل مرو

اے ترا اندر دو چشم ما وثاق
بیلتے ان کنت امعت الفراق

اس جوشِ محبت کو دیکھئے کہ ابوجہل جیسے دشمنِ اسلام کی زبان سے حضورؐ کی تعریف کرا رہے ہیں۔ ایسی انوکھی تعریف کسی نے کہاں سنی ہوگی! اور یوں دیکھئے تو یہ واقعی ابوجہل کے دل دل کی باتیں ہیں۔ یقیناً اس کا دل یہی کہتا ہوگا۔ کہ

"ہمارا سینہ محمدؐ کے ہاتھوں داغ داغ ہے۔ محمدؐ کے لعبہ چراغ گل ہوگیا۔ یہ قیصر و کسریٰ کے ہلاک کی باتیں کرتا ہے، ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا ہے، جادوگر ہے، اور اس کے کلام میں جادو ہے بلکہ یہ "لا الٰہ الا اللہ" کے دو کلمے ہی قیامت ہیں، ہمارے باپ دادا کے دین کی بساط کو الٹ دیا۔ اور ہمارے خداؤں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس کی ضرب سے لات و منات کے ٹکڑے ہو گئے۔ اے کائنات! اس نے انتقام لے: دل کو تاب سے لگایا ہے اور حاضرت بٹھا رہا ہے۔ بلکہ نقش حاضر کو اس کے افسوں نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کا مذہب ملک و نسب کا قاطع ہے۔ خود قریش سے ہے اور عرب کی فضیلت

کا منکر ہے! اس کی نگاہ میں بالا و پست برابر ہیں، اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھتا ہے۔ اس نے احرارِ عرب کی قدر نہ جانی اور حبش کے بھونڈے بدشکلوں کے ساتھ موافقت کر لی ہے، احمر و اسود کو ایک کر دیا ہے، اور اس طرح خاندان کی آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ یہ مواصلت اور یہ مواخات کیسی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سلمانؓ عجمی ہے ابن عبداللہ نے اس کے فریب میں آکر عرب کے سر پر ایک قیامت لا ڈالی ہے اولادِ ہاشم اپنی خودی سے غافل ہو گئی۔ یہ دور کعبت کیا پڑھیں ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں (کہ اپنے مقام کو بھی نہیں پہچانتیں) بھلا عجمی کی اصل عدنانی کیوں کر ہو سکتی ہے! اور ایک گونگا فصاحت میں سحبان کی برابری کس طرح ... کر سکتا ہے! خاصانِ عرب اللہ سے ہو گئے ہیں۔ اے نہ پھرا خاکِ گور سے کہ دن میں نکل آتا کر اس صحرا میں تو بھار الہٰ ہے آ۔ اور اس قرآن کے اثر کو باطل کر دے۔ اے سنگِ اسود! جو کچھ ہم نے محمدؐ کے ہاتھوں دیکھا ہے تو بیان کر۔ اے ہبل! اے بندوں کی عرض و معروض سننے والے! اپنے گھر کو بے کیشوں سے خالی کرا۔ ان کے گلہ کو بھیڑوں کے حوالے اور ان کے درختوں پر کھجوروں کو تلخ کر دے (ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دے۔ اور .....

اے منات! اے لات! یہ راستہ نہ چلو (ہم سے بے رخی اور دوری نہ اختیار کرو) اگر تم اس جگہ سے جاتے ہو تو ہمارے دلوں سے تو نہ جاؤ۔ تمہارا گھر ہماری ...

اقبالؔ نے ابوجہل کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں چھپی باتوں کو

نکال کر منظرِ عام پر نہ رکھا ہے۔ ابوجہل کے نزدیک ممکن ہے یہ حضورؐ اکرم کی مذمت ہو مگر حقیقت میں تعریف ہے۔ کیونکہ جن باتوں کو اس نے قبائح کی فہرست میں شامل کیا ہے یہ وہ فضائل و محامد ہیں جن کی نشر و اشاعت کے لئے حضورؐ مامور ہوئے تھے۔ غرضکہ نگاہِ عشق و مستی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ ایک عاشقِ رسولؐ کی بصیرت نے ان باتوں کو بھی دیکھ لیا جن کو ایک دشمنِ اسلام نے دل کے نہایت درجہ تاریک گوشوں میں چھپا رکھا تھا۔

زندہ رود فلک عطارد میں روحِ جمال الدینؒ افغانی سے ملاقات کرتا ہے اور اُن سے متعدد سوالات کرتا ہے۔ وہ ایک ایک سوال کا جواب دیتے ہیں۔ وہ مغرب کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید — ماند تے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ غارِ او در دلِ او ریختند — سنگ از خلوتش انگیختند
کی تواند منکرِ یزداں شدن — منکرِ او شانِ نبی نتواں شدن

درویش سودانی ملتِ عربیہ سے خطاب کرتا ہے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر ان کی غیرتِ خفتہ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سوئی ہوئی حالت پر غالب آنے کے لئے حضورؐ کا ارشاد یاد دلاتا ہے کہ ؎

از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰؐ است
مردِ ناروزِ بلا روزِ صفات است

حدیث شریف ہے:۔

وثلاثٌ من کنوزِ البرِّ۔ اخفاءُ الصدقۃ وکتمانُ المصیبۃ وکتمانُ الشکویٰ۔ یقولُ اللہُ تعالیٰ اذا ابتلیتُ عبدی ببلیۃٍ فکتمَ ولم یشکُ الیٰ عوّادہٖ ابدلتہٗ لحماً خیراً من لحمہٖ ودماً خیراً من دمہٖ فان اٰجرہٗ للمرض وان توفیتہٗ فالیٰ رحمتہٖ فان اٰجرہٗ للموت ولا ذنبَ لہٗ۔

اغفر لی جمیع ذنوبہ = تین چیزیں بھلائی کا خزانہ ہیں۔ صدقہ، مصیبت، اور شکایت کا چھپانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کو مرض کے ذریعہ آزماتا ہوں اگر اس نے اس پر صبر کیا اور تیمارداروں سے شکایت نہیں کی تو میں اس کے گوشت پوشت کو بہتر گوشت پوست سے بدل دیتا ہوں۔ اگر میں اسے اٹھا لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں لیتا ہوں۔ اور اگر بیماری سے نجات دوں تو اس حال میں تندرست کرتا ہوں کہ اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہوں۔

غالب کہتے ہیں ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

زندہ رود کہتا ہے ؎

من نمی دانم چہ رمز معنی ہنوز
آتشے دارد اگر ماء السحور!

غالب کی بجائے حلاج جواب دیتے ہیں ؎

باز نور مصطفیٰ اور ابہا ست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ ست

زندہ رود سوال کرتا ہے ؎

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا ست
سر آں جوہر کہ ناش مصطفیٰ ست
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود!

حلاج جواب دیتے ہیں ؎

پیش از گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ فرمودہ است
حد ما از فہم تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جوہرِ او نے عرب نے اعجم است | آدم است و ہم ز آدم اقدم است
سجدۂ صورت گر تقدیر ہا | اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدۂ ہم جان غزا ہم جان ستان | عبدۂ ہم شیشۂ ہم سنگِ گران
عبدۂ دیگر سیدۂ چیزے دگر | ماسرا پا انتظار او منتظر
عبدۂ با ابتدا بے انتہاست | عبدۂ را صبح و شام و کجاست
عبدۂ دہر است و دہر از عبدۂ ست | ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
کس ز سرِ عبدۂ آگاہ نیست | عبدۂ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدۂ | فاش تر خواہی بگو ہو عبدۂ
قبلۂ چندے ز چگون کائنات | عبدۂ را زد ز دُرون کائنات
مدعا پیدا کن و زیں دو بیت | تا نہ بینی از مقام نائر میت

بگذر از گفت و شنود اے زندہ رود
غرق شو اندر وجود اے زندہ رود

زندہ رود دریافت کرنا ہے ؎

کم شناسم عشق را ایں کار چیست
ذوقِ دیدار است یا دیدار چیست

حلاجؒ جواب دیتے ہیں ؎

معنیٔ دیدار آں آخر زماں | حکمِ او بر خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں | تا چو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را ایں ہمیں دیدار او ست | سنّتِ او سرّے از اسرار او ست

حضورؐ کے دیدار سے آپ کے احکام پر عمل کرنا مقصود ہے۔ دنیا میں رسولِ انس جان کی طرح زندگی بسر کرو تاکہ تم بھی اُس کی طرح مقبولِ انس و جان ہو جاؤ۔ اس کے بعد اپنے آپ کو دیکھو یہ دیکھنا اس کا دیدار ہے۔ یعنی اس کی سنّت میں اُس کا راز پوشیدہ ہے۔

رومی کی زبان سے سلطان شہیدؒ (ٹیپو) کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے نہیں
کہ وہ سلطانِ دکن تھا بلکہ اس لئے کہ عشقِ رسولؐ تھا ؎

آں شہیدانِ محبت را امام | آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر | خاکِ قبرش زین و تو زندہ تر
عشق ریزے بود بر صحرا نہاد | تو نہ دانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین | فقرِ سلطان وارث جذبِ حسینؓ

رفت سلطاں زیں سرائے ہفتہ روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

سلطان شہیدؒ زندہ رود سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے تو دادندہ حرقِ دل فروز | از تپِ اشکِ تو سوزم ہنوز
کاروانِ ناخنِ مردانِ راز | جوئے خوں بکشاد از کہسارِ ساز
آں نوا کز جانِ تو آید بروں | می نہد بر سینہ را سوزِ درون
بودہ ام در حضرتِ مولائے کل | آنکہ پیدا و نہاں گردد سبل
گرچہ آنجا جرأتِ گفتار نیست | روحِ ما را کارے جز دیدار نیست
سوختم از گرمیٔ اشعارِ تو | برزہا نم رفت افکارِ تو
رقتِ ایں بیتے کہ بر خواندی ز کیست؟ | اندرو ہنگامہ ہائے زندگیست

جاں سوزے کہ در سازِ دجاں | یک دو حرف از ما بہ کاخِ دیگراں
در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشترک آید سرودِ اندر سرود

سلطان شہیدؒ زندہ رود سے فرماتے ہیں۔ اللہ نے تجھ کو تاثیرِ
کلام کی دولت عطا کی ہے۔ تیرے اشعار کی گرمی سے میں اب تک
جل رہا ہوں۔ وہ آواز جو تیرے دل سے نکلتی ہے ہر دل میں سوزِ

نسبت پیدا کرتی ہے میں مولانا کے حضور میں موجود تھا، وہ کہ جس کے بغیر دین کا راستہ طے نہیں ہوتا، اگرچہ وہاں کسی کی جرأتِ گفتار نہیں ہے اور روح کو دیدار کے سوا کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر تیرے اشعار سے میں ایسا متاثر ہوا کہ بیساختہ میری زبان پر آ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اشعار جو تو نے پڑھے کس کے ہیں؟ ان میں ہنگامہ ہائے زندگی پوشیدہ ہیں۔

اس کے بعد سلطان شہیدؒ فرماتے ہیں کہ اُسی سوز کے ساتھ جو روح میں پیوستہ ہوتا ہے ہماری طرف سے دو ایک باتیں دریائے کاویری کو پہنچا دے۔ دنیا میں تو بھی زندہ رود ہے اور وہ بھی زندہ رود ہے۔ اور سرود اندر سرود بڑے لطف کی چیز ہے۔

"خطاب بہ جاوید" میں فرزند کو نصیحت فرماتے ہیں جو اصل میں تمام نئی نسل کے لئے ہے ؎

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست — بے ادب بے رنگ و بوئے آبروست
تو جوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یادِ عہدِ مصطفیٰؐ آید مرا!
در زمانِ خود پشیماں می شوم — در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم
ستر زن یا روح یا خاکِ لحد — ستر مرداں حفظِ خویش از نارِ بد

آخر میں فرماتے ہیں ؎

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر آنہ رقصِ جاں گیری نصیب
ستر دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دُعا گویم ترا

مثنوی مسافر

نادر شاہ بادشاہِ افغانستان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

فقر و شاہی واردات مصطفیٰؐ است — این تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰؐ است
این دو قوت از وجودِ مومن است — این قیام و آں سجودِ مومن است

اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہیں ؎

اے ز خود پوشیدہ خود را باز یاب! — در مسلمانی حرام است این حجاب
رمزِ دینِ مصطفیٰؐ دانی کہ چیست؟ — فاش دیدن خویش را شہنشاہی ست
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

حکیم سنائیؒ کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں تو ان سے سوال کرتے ہیں کہ اسرارِ غیب سے جو کچھ آپ پر منکشف ہے بیان کیجئے۔ روحِ حکیم جواب دیتی ہے ؎

سوسناں تر یہ سپہر لاجورد — زندہ از عشقِ اندرے از خوابِ خورد
می ندانی عشق و مستی از کجاست؟ — این شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ است
با خبر شو از دمِ آب و گِل — پس بزن بر آب و گِل اکسیرِ دل
مصطفیٰؐ بحر است و موجِ او بلند — خیز و این دریا بجوئے خویش بند
تہ تہ بر ساحلش پیچیدۂ — لطمہ ہائے موجِ او نادیدۂ
یک زماں خود را بدریا در فگن — تا روانِ رفتہ باز آید بہ تن

قندھار جاتے ہیں اور وہاں حضورؐ کے خرقۂ مبارک کی زیارت کرتے ہیں تو خرقۂ مبارک کی تعریف جن الفاظ میں کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے ؎

فقر را "تاریخ تا بیضا" ان — دیدش در نکتۂ "لی مع اللہ" ان

دین او آئین او تفسیر او — در جبین او خطِ تقدیرِ او

عقل را او صاحبِ اسرار کرد — عشق را او تیغِ جوہر دار کرد

نازِ عشق را او معراج است — با ہمہ یکتائی فاکیر او دل است

آشکارا او پذیرش اسرائے ما — در ضمیرش مسجدِ اقصائے ما

آمد از پیرایہ او بوئے او
داد ما را نعرۂ اللہ ہو

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

فقر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مومناں را گفت آن سلطانِ دیں — مسجدِ ما ایں ہمہ روئے زمیں

ایں جہاں از گردشِ نہ آسماں — مسجدِ مومن بلد ست دیگراں

تخت کو شد بندۂ پاکیزہ کیش — تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

ایک از ترکِ جہاں گوئی مگو — ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ او

مرا کشتن بودن از دوار ستن است — از مقامِ آب و گل بر جستن است

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن — اے مسلماں مردن است ایں زیستن!

مرد حق باز آفرید خویش را — جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد؟

عصرِ ما ما را ز ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفیٰ بیگانہ کرد

سوزِ او نالہ از میانِ سینہ رفت　　جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

کہتے ہیں مسلمان ذوق و شوق اور سوز و درد سے خالی ہو گیا۔ اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ عصرِ حاضر نے اس کو جہاں مصطفیٰؐ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اور ذوق و شوق اور سوزِ عشقِ مصطفیٰؐ اس کے سینے سے کبار رخصت ہوا! جوہرِ آئینہ آئینہ سے جاتا رہا۔ اب یہ نام کا مسلمان ہے مگر مسلمان کے مقام سے کوسوں دُور ہے۔

"در اسرارِ شریعت" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

مال را گر بہرِ دیں باشی حموں　　"نعم مالٌ صالح" گوید رسولؐ
گر بداری اندریں حکمت نظر　　تو غلام و خواجۂ دلتو سیم و زر
از تہی دستاں کشادِ اُمتاں　　از چنیں منعم فسادِ اُمتاں
اے خوشا منعم کہ چوں درویش زیست!
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست!
شرعِ می خیزد ز اعماقِ حیات　　روشن از نورش ظلامِ کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام　　تا قیامت بحکمہ ماند ایں نظام
حکمتش از عدلِ تسلیم و رضاست　　نیم او اندر خیرِ مصطفیٰؐ است
از فراق است آرزو ہا سینہ تاب　　تو نمانی چوں شود او بے حجاب

بالِ جبریل

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ ہر فتراکِ صاحب دل ہے بستم سرِ خود را!
وہ راہے سہل تر ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

معراجِ مصطفیٰؐ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ضربِ کلیم ۔ معراج

تا کہ ہو مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سر سراپردۂ حجاب نکتۂ معراج!

نو متنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مرتبہ جز ابھی چاند کا محتاج

ایک فلسفہ زدہ سید زادے سید کو لکھتے ہیں ؎

دل در سخنِ محمدی بند
اے پیرِ علیؓ ز بوعلی چند

ایک نظم بعنوان "اے روحِ محمدؐ" لکھی ہے۔ حضورؐ سے عرض کرتے ہیں مگر اپنا دکھ درد نہیں بلکہ یہ کہ ؎

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر!
اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے!

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ خطر میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفاں کدھر جائے!

اگر چند ہے یہ قافلہ زادِ حلم و زاد
اس کوہ و بیاباں کی حدی خواں کدھر جائے!

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے!

اشعار بالا سے اقبال کے عشق رسولؐ، ان کی شیفتگی و فریفتگی کا کسی قدر اندازہ ہو گیا اور ان کے محبوبؐ کی ان ادائوں کا بھی پتہ چل گیا جو ان کی دلبری کا باعث ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عشق رسولؐ سے ان کی مراد کیا ہے۔ یہاں تک ان کی قریب تمام تصانیف ختم ہو جاتی ہیں اور ہم اشاعت کی ترتیب سے ان کی مستند تاریخ ارتقائی جائزہ لے چکے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو شعر اور عشق ان کے سینے میں پیدا ہوا تھا کس طرح ترقی کرتا گیا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آخر تک سیدھی عاشق نہ تھے بلکہ انھوں نے اس "انسانِ کامل" میں وہ صفات دیکھی تھیں جو آدم سے لیکر آج تک کسی انسان میں جمع نہ ہو سکیں۔ نیز یہ وہ صفات ہیں جو نوعِ انسانی کے لئے سراپا رحمت و رافت ثابت ہو چکی ہیں۔ اور ان عالمگیر ابدی امکانات کی حامل ہیں کہ جب اور جہاں کہیں بھی انسان ان کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اپنے آپ کو اطمینانِ روح، طمانیتِ خاطر اور حقیقی مسرتوں کی دنیا میں پائے گا۔

اب ہم ان کی کتاب "ارمغانِ حجاز" پر آجاتے ہیں جو بالکل آخری اور اس زمانے کی تصنیف ہے کہ جب وہ حج کا ارادہ کر چکے تھے اور زیارت حرمین شریفین کے لئے بیتاب تھے۔ ایسے بیتاب کہ آپ کہتے ہیں آسمی، رضی پاک کا ذکر زبان پر رہتا تھا۔ اور یہ اشعار بھی جن کا مجموعہ ارمغانِ حجاز ہے وہیں کے لئے لکھ رہے تھے۔ اس کتاب میں ان کا عشق دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اب وہ حضورؐ سرورِ کائنات کے متعلق تمام معارف یقین طے کر کے حق الیقین کے درجے میں پہنچ گئے ہیں۔ غرض۔ اس زمانے کے عشق کی کیفیات کو بھی ملاحظہ فرمائیے مگر ساتھ ہی انسانہ کے آئینوں میں اپنی اور اپنی قوم کی حالت بھی دیکھتے جائیے کہ اقبال دیوانہ عشق ضرور ہے مگر اپنے کام میں ہوشیار بھی بلا کا

-:-

انتقال سے دس پندرہ منٹ پہلے جو رباعی زبان پر تھی اور جس کی شہرت عالمگیر ہو چکی ہے اس کے ذریعہ یہ راز اچھی طرح فاش ہو گیا کہ نسیم حجاز ہی اُن کو پیغام دوست لاتی تھی۔ اور وہ اس پیغام کی ترجمانی شعر کے ذریعہ کیا کرتے تھے ــــ یعنی اُن کے اشعار میں جو بلبلیاں ... کوندتی نظر آتی ہیں اُن کا تعلق اسی وادیٔ ایمن سے ہے جس کو "حجاز مقدس" کہتے ہیں ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

روزِ حشر کے حساب کا خیال آتا ہے تو عذابِ دوزخ کا اندیشہ نہیں بلکہ یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر وہ حساب حضورؐ کے روبرو ہوا تو بڑی رسوائی ہو گی! حضورؐ کو کیا منہ دکھاؤں گا! اس لئے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ جس دن ہر پوشیدہ تقدیر بے نقاب ہو تو مجھے حضورِ خواجہؐ رسوا نہ کر۔ میرا حساب حضورؐ کی نگاہ سے پوشیدہ لینا ؎

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا — حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

یہاں بھی اپنے حساب سے اپنی رسوائی سے پہلے قوم کی رسوائی کا خیال آتا ہے۔ ورنہ تیسرے مصرع میں "مارا" کے کیا معنی!

اس تصور سے کہ مکہ سے فارغ ہو کر مدینہ روانہ ہو رہے ہیں۔

فرطِ شوق میں خدا سے کہتے ہیں ؎

بدن دامانہ و جانم ز رنگِ پوست | سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش اینجا و با خاساں بیامیز | کہ من دارم ہوائے کوچۂ دوست

کتاب کا دوسرا حصہ "حضورِ رسالت" شروع کرنے سے پہلے حضرت بخاری کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

چونکہ یہ سفر ہیری میں اختیار کر رہے ہیں اس لئے تمثیل کس قدر موثر و دل گداز ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بایں ہیری رہ یثرب گرفتم | نوا خاں از سرورِ جانفشانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام | کشاید پر بفکرِ آشیانہ

صحرائے حجاز میں مدینہ کی طرف قافلے چلے جا رہے ہیں۔ قافلے والے اُونٹوں کو کبھی ہنکاتے ہیں اور درود بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ کیسا پیارا منظر ہے: ایک مسلمان کو یہ منظر دیکھنا نصیب ہو جائے تو پھر اور کیا چاہئے! کہتے ہیں اے مسافر! اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر۔ اور یہاں تک کہ کر کہ ریت کی گرمی سے پیشانی پر جلنے کا نشان باقی رہ جائے ؎

چہ خوش صحرا کہ دروے کاروانہا | درودے خوانند و محمل براند
بہ ریگِ گرم او آور سجودے | جبیں را سوز تا داغے بماند

چہ خوش صحرا کہ شامش صبحِ خنداست | شبش کوتاہ و روزِ او بلند است

قدم اے راہرو آہستہ تر نہ　　جو ماہر ذرۂ او در سند است

ذرا عاشقانِ رسولؐ اس رباعی کو پڑھیں! نالہ و فغاں کرنے اور آنکھوں کو قدموں سے ملنے کی تمنا ہے مگر اس کام میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں اس لئے یہ نالہ و فغاں سرورِ کائنات کے حضور میں کر رہے ہیں اور یہ قدم بوسی خواجۂ دو جہاں کی نصیب ہو رہی ہے! ؎

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مزارِ دل بگوئیم　　بپائے خواجۂ خوباں رسانیم

کہتے ہیں حکیموں اور فلسفیوں کو نہیں پوچھا گیا۔ اس لئے کہ یہاں دردِ دل، سوزِ جگر اور پھر اللہ کا فضل و کرم چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ایک نادان گور اپنی طرف اشارہ ہے) جلوۂ مستانۂ دوست سے نوازا جا رہا ہے! کیا نصیب ہے اور کتنا اچھا وقت ہے! کہ شہنشاہِ کونینؐ کا دروازہ ایک ادنیٰ درجے کے فقیر کے لئے کھولا جا رہا ہے! ؎

حکیماں را بہا کمتر نہادند　　بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے، چہ خورم روزگارے　　درِ سلطاں بدرویشے کشادند

مدینہ میں فانی انسان عشقِ نبیؐ کی بدولت جاودانی ہو جاتا ہے۔ یہاں کی خاک سے بغیر سوز کے معانی آگئے ہیں۔ ہر اوراست دلوں میں اسرار و رموز کا القا ہوتا ہے۔ حکیم ہو خواہ کلیم سب کے دلوں پر انوار و تجلیات کا فیضان ہوتا ہے۔ یہاں سے کوئی محروم نہیں جاتا۔ اس لئے کہ یہاں لوحِ شرائع ہیں۔ کسی کو جواب نہیں ملتا ؎

دریں وادی زمانی جاودانی — ز خاکش بے نمود روید معانی
حکیماں با کلیماں زد دش بر دوش — کہ اینجا کس نگوید کن سرائی

حضورؐ سے عرض کرتے ہیں کہ مسلمان جو فقیری و بادشاہی دونوں کا مالک تھا اس کا دل سوزِ محبت سے خالی ہو چکا ہے نالہ کرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ کیوں کرتا ہے (مصیبت یہی ہے کہ ساتھ ہی کوئی مقصدِ حیات اپنے سامنے نہیں رکھتا کہ یہ رونا دھونا مقصد کے لئے ہو۔ پس یونہی روتا ہے ظاہر ہے کہ یہ انتہائی پستی کا مقام ہے) لیکن حضورؐ آپ اس کی نادانی پر نہ جائیے بلکہ اس کو ایک نگاہِ کرم سے نواز دیجئے۔ حضورؐ کی نگاہِ کرم سے اس کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے — دریدہ از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد ہمی از اللہ و نالد — نگاہے یا رسولؐ اللہ نگاہے

عرض کرتے ہیں کہ میرے دل کی بے قراری حضورؐ ہی کے سوزِ غم سے ہے اور میری شاعری بھی حضورؐ ہی کے دمِ (فیضانِ روحانی) کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوں کہ آج سارے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کا محرم ہو (یعنی آپؐ کے مقصدِ نبوت کو سمجھنے والا ہو) تو اقبالؔ کے پیغامِ حیات کہ جو قرآن کریم کی تعلیمات پر مبنی ہے اور حضورؐ ہی کی آواز ہے۔ یہ کہنے کی جرأت کون کر سکتا تھا۔

گفت بر ما ہند و افسونِ فرنگ
ہست خود نایش ز قانونِ فرنگ

رباعی ؎

تب و تابِ دلم از سوزِ غم تست | نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند | ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

عرض کرتے ہیں حضور! ہندی مسلمانوں کا بہت برا حال ہے! آپؐ کی نظرِ کرم کے سب سے زیادہ مستحق ہیں! اس لئے کہ آج ایشیا میں ان سے زیادہ بیچارہ و درماندہ کوئی نہیں ہے ؎

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست | بیا خاکِ آفتابے را گذر نیست
بیا کن گوشۂ چشمے کہ در شرق | مسلمانے ندارد بیچارہ نیست

اُس فقیرِ دردمند یعنی مسلمان کا حال کیا عرض کروں جو عملاً ارجمند ہے! خدا اس سخت جان کے حال پر رحم کرے کہ بے چارہ بہت اونچے مقام سے گرا ہے۔ اس کے احوال کو کس طرح لب پر لاؤں۔ آپ تو میرے ظاہر و باطن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے دو سو سالہ رُوداد کا اندازہ اس سے فرمالیجئے کہ اس روئداد نے میرا دل ایسا کر دیا ہے جیسا کہ کندۂ قصاب ؎

چہ گویم زیں فقیرِ دردمندے | مسلمانے بگو ہر ارجمندے
خدایا ایں سخت جاں را یار ما دار | کہ افتادست از بامِ بلندے

چساں احوالِ او را بر لب آرم | تو می دانی نہاں در سینہ دارم
ز روداد دو صد سالش چنیں بس | کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم

اور ابھی تو آسمان اس کے ساتھ دشمنی پر تلا ہوا ہے۔ ابھی اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوا کب ہے! اس کے کام کی ابتری آپؐ سے کیا عرض کروں۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ ان کا کوئی امام (لیڈر) نہیں ہے۔ ایک بے سری فوج ہے۔

اقبالؔ نے ایک خط میں چودھری نیاز علی خاں (رامپور دارالاسلام ہندستان کوٹ) کو ۲۰ جولائی ۳۷ء کو لکھا تھا "اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے اُن کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ انشاءاللہ آپکا ارادہ اس مقصد کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیہ سب سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں۔ اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے۔ لیکن ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے" ذیل کی رُباعی میں بھی حضور نے اسی بات کی شکایت کی ہے ؎

ہنوز اندر خمِ چرخِ نیلی کُمیت است — ہنوز اندر کمارِ دوراں دُرِ نظام است
رکارے بے نظام او چہ گویم — نوائے دل کہ ملت بے امام است

مسلمان کے خون میں پہلے کی سی حرارت نہیں رہی۔ اور اب مے کی کثرتِ خراب سے لالہ بھی نہیں اگتا۔ یعنی اس کے خون میں بھی حرارت نہیں ہے اور اس کے دل میں بھی داغِ عشق و محبت نہیں ہے۔ میان تلوار سے خالی ہے اور جیب زر سے۔ بزدل بھی ہو گیا اور مفلس بھی۔ رہا قرآن مجید سو اس کو اپنے خانۂ ویراں کے طاق میں رکھ دیا ہے کہ اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی ؎

؎ مکاتیب اقبال صفحہ ۳۰

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش — نروید لالہ از کشتِ خراب است
نیامِ او تہی چوں کاسۂ او — بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

عرض کرتے ہیں حضورؐ! ہندی مسلمانوں کا حق دیکھئے۔ یہ آپ سے خیرات مانگتے ہیں۔ اور خیرات کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ مسکین بھی ہیں، فقیر بھی ہیں اور اسیر بھی اور ایک اور وجہ سے بھی یہ آپ کے کرم کے مستحق ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی غیرت نہیں مری ہے۔ کتنے ہی خراب و خستہ ہو گئے مگر غیرت دینی اب بھی ویسی ہی رکھتے ہیں اور اس دینی غیرت ہی کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔

حقِ آں دہ کہ مسکین و اسیر است — فقر و غیرتِ او دیر میر است
بروئے او درِ میخانہ بستند — دریں کشورِ مسلماں تشنہ میر است

حضورؐ! مسلمان کے دل کو پاک کر کے پھر اس میں جہانِ (مقاصد) پیدا کر دیجئے۔

زمانے کی ہوا بہت تیز ہے اور اس کے دامن میں سینکڑوں سوراخ اس چراغِ بسملؔ کی آپ ہی حفاظت فرمائیں گے۔ (حوادث نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور یہ بدستور برائیوں میں مبتلا ہے اور ایک دو نہیں سینکڑوں برائیوں میں! ایسی صورت میں آپ توجہ نہ فرمائیں گے تو اس کی عزت کا چراغ کس طرح روشن رہ سکے گا!)

دگر پاکیزہ کن آبِ گِلِ او — جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک — بیندیش از چراغِ بسملؔ او

ملوکیت سراسر فریب ہے۔ اور اس فریب سے نہ وہ محفوظ ہیں نہ حجازی۔ اس لئے حضور سے مسلمانی کی مصیبت عرض کرتا ہوں۔ اور اس امید پر عرض کرتا ہوں کہ حضور کی اتباع میں ملوکیت کو لعنت سمجھنا چاہیئے تھا مگر کیسے غضب کی بات ہے کہ ملوکیت کا مٹانے والا خود ملوکیت کا دلدادہ ہو گیا! اور اس وجہ سے یہ دبا روم ہی میں نہیں حجاز میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں پھر حضور ہی کی توجہ درکار ہے تاکہ اس بلا کے پنجۂ استبداد سے دنیا کو نجات ملے! ؎

ملوکیت سراپا شیشہ بازی ست — از و ایمن نہ رومی نے حجازی ست
حضورِ تو نیم یاراں بگو یم — بامید ے کہ وقتِ دلنوازی ست

عرض کرتے ہیں کہ حضور مجھ سے نہ پوچھئے مسلمان کا کیا حال ہے! اس کی دنیا بھی خراب ہے اور آخرت بھی۔ اور کس قدر رونے کا مقام ہے کہ جس مرغ کو حضورؐ نے انجیر کھلا کر پالا تھا۔ آج اس کو صحرا میں دانہ بھی تلاش گراں ہے (یعنی جس کو حضورؐ نے اپنی تعلیم سے محنتی، جفاکش اور سختیوں کا مقابلہ کرنے والا بلند حوصلہ بنایا تھا آج وہ ایسا پست فطرت اور تن آسان ہو گیا ہے کہ اس سے اپنی روٹی بھی نہیں کمائی جاتی) ؎

مپرس از من کہ احوالش چساں است — زمینش بد گہر چوں آسماں است
بداں مرغے کہ پروردی بانجیر — تلاشِ دانہ در صحرا گراں است

میں نے مسلمان کے آگے اسرارِ زندگی کھول کر رکھ دیئے اور اس کو ماضی و مستقبل کے حقائق سمجھا دیئے (کہ ماضی کیوں شاندار تھا اور مستقبل کس طرح با اقبال ہو سکتا ہے) سرِ زندگی اس سے بھی زیادہ واضح طریقہ پر بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کی تشریح عرب طریقت فرما دیں، اقبال کی نطق سے یہ بھی مانگتے ہیں تو، سرِ حیات بیان کرنے کے لئے تاکہ قوم کی بے حسی دور کر سکیں ؎

بہ چشمش وا نمودم زندگی را — کشودم نکتۂ فرداد دمی را
تو ای سرِ رواں را ناشنا تر گفت — بدہ طرزِ عرب ایں اعجمی را

دہریت اور الحاد نے دنیا کو کیا سے کیا کر دیا ہے! مغرب کی مہذب دنیا کے رہنے والے روح کو مادے سے بالاتر کوئی چیز نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ انسان صرف سامانِ مادی کے امتزاج کا نام ہے اور روح بھی مادے ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے جو جسم کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ نہ جزا کے قائل ہیں نہ جزا و سزا کے۔ مسلمان جس کام کا تھا اس الحاد کو ختم کرنا وہ وقت تن آسانی ہو کر رہ گیا۔ اس لئے میں فقیر میں سے جو حضور نے صدیق اکبرؓ کو عنایت فرمایا تھا۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کو بھی عنایت فرما دیجئے۔ تاکہ ان میں جو زندگی ہے اس کو ان کے سوا اور کوئی اس کی روح کو ختم نہیں کر سکتا ؎

دگرگوں کرد لادینی جہاں را — ز آثارِ بدن گفتند جاں را
از آں فقرے کہ صدیقؓ ذادی — بشو مے آدر ایں آسودہ جاں را

ہم غیر اللہ کے آگے پیشانی گھستے اور آتش پرستوں کی طرح تعریف کے

گیت گاتے ہیں۔ حضورؐ! میں کسی اور کی شکایت نہیں کرتا خود اپنی شکایت کرتا ہوں۔ کہ ہم آپ کے شایانِ شان ہرگز نہ تھے (بھلا آپؐ کی امت اور غیر اللہ کے آگے جبیں سا اور ستائش گر!) ؎

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم | چو گبران در حضورِ او سجودیم
ستائم از کسے، می نالم از خویش | کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

گہے افتم گہے مستانہ خیزم | چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سرِ بام | کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

مجھے تنہائی میں آہ و فغاں کرنے میں مزا آتا ہے۔ اس لئے مدینہ کی طرف بے کارواں سفر کرنا میرے لئے اچھا ہے۔ بھلا کہاں مکتب اور کہاں میخانۂ شوق! حضورؐ ہی فرمائیں میرے لئے یہ اچھا یا وہ اچھا! ؎

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ | سوئے یثرب سفرِ بے کارواں بہ
کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق | تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

میں نے جو اسرار بیان کئے اُن کو یہ نہ سمجھ سکے۔ اس لئے میرے کلام سے ان کو نفع نہ ہوا۔ مگر اے میرے اُممؐ! آپؐ سے فریاد ہے کہ لوگوں نے مجھے غزل خواں سمجھ لیا ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند | ز شاخِ نخلِ من خرما نہ خوردند
من اے میرِ اُممؐ داد از تو خواہم | مرا ہمراہِ غزل خوانے شمردند

حضورؐ کا حکم تھا کہ حیاتِ جاوداں کے اسرار بیان کر۔ اور مُردوں کے کان میں زندگی کا پیغام پہنچا۔ (میں نے حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں زندگی ہی کے اسرار بیان کئے۔ مگر یہ ناحق شناس مسلمان زندگی کے اسرار معلوم کرنے کی بجائے مجھ سے کہتے ہیں کہ ایں و آں کی تاریخِ وفات لکھ۔ یعنی ان کو موت ہی کے معاملات سے دلچسپی ہے ؎

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے | بگوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں | کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گوئے

میں نے خود شناس مسلمان کو خودی سے آشنا کیا۔ گویا اس خاک میں زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔ آپ مجھے وہ نالۂ گرم عطا کر دیجئے کہ اس کے دل سے غم دین کے سوا تمام غموں کو جلا دوں ؎

خودی دادم ز خود نامحرمے را | کشادم در دلِ او زمزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ از دے | بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را

میں موجِ ہوا سے آب و رنگ حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ حضورؐ کے آفتابِ فیض سے نمو پاتا ہوں۔ اسی لئے میری نگاہ ماہ پروین سے بلند ہے۔ اور میں کسی کے مزاج کو دیکھ کر شعر نہیں کہتا۔ کوئی خوش ہو یا ناخوش حق بات کہتا ہوں۔ (جو کسی کی مدد کے سہارے رہتے ہیں وہ دوسروں کی مرضی کے شعر کہتے ہیں)۔

نمود رنگ از دمِ بادے نجویم | ز فیضِ آفتابِ تو بروئیم
نگاہم از مہ و پروین بلند است | سخن را بر مزاجِ کس نگویم

دریائے عشق بے پناہ ہے اور اکنار ہے۔ اس میں عشاق وہ بہادر ہیں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ جدھر دل لے جاتا ہے عشاق اسی طرف جاتے ہیں۔ تمکو آپ کا حکم ہے اس لئے بطحا کا راستہ اختیار کیا ہے ورنہ ہمارا دل تو آپ ہی کی طرف لے جا رہا ہے ؎

در آں دریا کہ او را ساحلے نیست — دلم با عشقش پرواز در نیست
تو فرمودی رہ بطحا گرفتم — وگرنہ جز تو ما را مقصدے نیست

مرا از دور کہ مشتاق حضوریم — ندانی درد ہجر کہ دانی ناصبوریم
یہ فرما ہر چہ می خواہی بہ جز صبر — کہ ما از دے دو صد فرسنگ دوریم

فقیر ہوں، مگر جو کچھ نکلتا ہوں۔ آپ سے نکلتا ہوں۔ میرے برب کاہ سے پہاڑ کے دل کو زخمی کر دیجئے اور میرے معمولی اشعار میں وہ تاثیر بھر دیجئے کہ ان سے سخت سے سخت دل بھی پگھل جائیں۔ فرنگیوں کی تعلیم میرے لئے درد سر کا باعث ہوئی۔ اس لئے کہ میں نے ان کو پریشان دماغ دفا ندان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر آغاز کتاب میں کیا جا چکا ہے ؎

فقیرم از تو خواہم آنچہ خواہم — دلم کو ہے خراش از برگ کاہم
مرا درس حکیماں درد سر داد — کہ من ہم دردہ فیض نگاہم

نہ با ملا نہ با صوفی نشینم — کہ تو دانی کہ من آنم نہ اینم
نویسم اللہ بر لوح دل من — کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

منبر پر بیٹھا کی تقریر بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی بغل میں سینکڑوں کتابیں ہیں میں نے حضورؐ کے آگے شرم سے عرض نہیں کیا ہے۔ ورنہ حضورؐ! اس کو اپنی خبر نہیں اور ہماری فکر ہے۔ خود شناس اگر خود نما ہو تو ایک حد تک مناسب بھی ہے مگر یہ خود شناسی سے کوسوں دُور ہوئے خود نمائی کے لئے منبر پر دھواں دھار تقریریں کرتا ہے ؎

سرِ منبر کلاش بیش دارا است | کہ اورا صد کتاب اندر کنارش
حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم | ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

میری آنکھوں میں آپؐ ہی کی عطا کردہ روشنی ہے (یہ ایمانی بصیرت آپؐ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) اور جبکہ آپؐ نے میری رات کو فروغِ ماہ سے روشن کیا ہے تو پھر مجھے صبح من رآنی کا جلوہ بھی دکھلا دیجئے۔ یعنی ان... مشتاق نگاہوں کو اپنے دیدار سے منور کر دیجئے ؎

بہ چشمِ من نگہ آوردہ تست | فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبحِ من رآنی | شبِ من را مہتاب آوردۂ تست

مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَاَ اللّٰہَ = جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا۔ (حدیث شریف)

جب میں نے خود کو ہر طرف سے سمیٹ کر معرفتِ نفس کی طرف لگا دیا اور حضورؐ کی عطا کردہ روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنی نگاہ صبح نگاہی سے دُنیا میں عشق و مستی کا ایک جہاں پیدا کر دیا ؎

چو خود را در کنارِ خود کشیدم | بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی | جہانِ عشق و مستی آفریدم

گلستانے ز خاکِ من برانگیز — کم چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را — نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

بجوئے تو ہر افروزم نگہ را — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

بکوئے تو گدازِ یک نفس بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خرابِ جرأتِ آں رند پاکم
خدا را گفت مارا مصطفیٰ بس

کہتے ہیں میں نے تو وہ ہائے و ہوئے عشق سیکھ لی ہے جو پتھر سے چشمہ جاری کرتی ہے (سنگِ دل بھی میرے کلام کی تاثیر سے پگھل جاتے ہیں۔ مگر ایک آرزو رکھتا ہوں۔ وہ یہ کہ جاوید کو بھی حضورؐ کے عشق سے رنگ و بو حاصل ہو ؎

ز شوقِ آں ختم آں ہائے و ہوئے — کہ از سنگے کشاید آبجوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید — ز عشقِ تو بگیرد رنگ و بوئے

کہتے ہیں یہ جہانِ عشقِ الٰہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور اسی کے لئے قائم ہے۔ اور عشق کا ظہور محمدؐ رسول اللہؐ کے سینے سے ہوا ہے۔ یعنی جہان میں جو کچھ عشقِ الٰہی ہے یہ حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عشق کا اثر ہے۔

آپؐ نے عشق کر کے دکھلایا اور دُنیا نے آپؐ سے عشق کرنا سیکھا۔ اور آج بھی جہاں کہیں سرورِ عشق باقی ہے یہ آپؐ کا صدقہ ہے۔ رہا جبرئیل کا وجود سو وہ بھی آپؐ ہی کے آئینہ کا جوہر ہے۔

جوہر آئینے سے قائم ہوتا ہے۔ آئینہ جوہر سے قائم نہیں ہوتا۔ نیز جوہر آئینے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح حضورؐ سرورِ کائنات نہ ہوتے تو جبرئیل کس کے پاس آتے۔ بعض فلاسفہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جبرئیل علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ مُلکاتِ نبوّت میں سے ایک ملکہ یا قوائے ملکوتی میں سے ایک قوّت ہے جو اللہ نے پیغمبر میں ودیعت کی ہے۔ پھر یوں بھی جبرئیل ایک قاصد ہیں قاصد کو پیغام کی حقیقت کیا معلوم! اور جب پیغام کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو عمل کر کے دکھلانا کیا معنی! ؎

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست — سرورش از مئے دیرینۂ تست
جزو این چیزے نمی دانم ز جبریل — کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست — بتا کم موجِ نے از زمزمِ تست
خجل ملکِ جم از درویشیِ من — کہ دل در سینۂ من خرم تست

عرض کرتے ہیں، میری مُشتِ غبار سے وہ لالہ اُگا ہے۔ جس کا خون میرے پہلو سے ٹپک رہا ہے آپ از راہِ دلنوازی اس کو قبول فرمائیے کہ میں داغ کے سوا اور کوئی چیز نذر کرنے کے قابل نہیں رکھتا۔ (لالہ: جو محبتِ رسولؐ میں خون ہو چکا ہے)؎

دمے بر آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم

قبولش کن ز راہِ دل نوازی
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

دل ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہوں مگر کوئی لیتا نہیں۔ ایک متاع رکھتا ہوں جس کا غارت گر کوئی نہیں ہے۔ افسوس کہ ایسی متاع کا بھی اس بازار میں ... نا پرسال میں کوئی خریدار نہیں! لہٰذا ایسا میں ایک ہی شخص ہوں۔ حضورؐ! میری بے کسی و تنہائی پر رحم کیجئے۔ اور میرے سینے میں آباد ہو جائیے۔ ماحاصل یہ کہ دل آپؐ کی محبت میں سرشار رہے۔ تو اب آپؐ دُور کیوں ہیں؟

دلے بر کف نہادم دلبرے نیست — متاعے داشتم، غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر — مسلمانے ز من تنہا تر ے نیست

"ملتِ حیفا کے حضور میں" عرض کرتے ہیں کہ ماہِ نو کی طرح منزل تک پہنچنے کی کوشش کر لیتی ہر قدم آگے بڑھانے اور ترقی کرنے کی سعی کرنی چاہئے۔ اور اگر اس دنیا میں اپنا کوئی مقام مطلوب ہے تو خدا سے دل لگا اور مصطفیٰؐ کے راستے پہ چل۔ ترقی و تعالی مسلمان کی یہیں ہے کہ وہ حدودِ مصطفیٰؐ سے باہر نہ ہو۔

بہ منزل کوشش، اے نو مہ نو — دریں نیلی فضا بر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر — بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ گیر

میں نے تقدیر کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیا ہے نا امید نہ ہو اور راہِ مصطفیٰؐ اختیار کر کہ اسی میں کامیابی و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ اور اگر میری بات کا یقین نہیں تو تیری مرضی دین سے بھاگ کر کافر کی موت مر۔

نشودم پردہ را از روئے تقدیر — منو نو سید در راہ مصطفیٰ گیر
اگر پاد ہ ندار ی آنچہ گفتم — زدیں بگریز مرگ کافر ست

اقبال کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" بھی ختم ہو گئی۔ اب ایک دوسرے طریقے سے اُن کے "عشقِ رسولؐ" کا جائزہ لیتے ہیں۔

عشق و محبت کے الفاظ بڑی دلکشی ہے۔ کیسے شیریں اور کیف انگیز الفاظ ہیں! اور جب ان کے ساتھ لفظ "رسولؐ" کو اور ملا دیا جائے تو اُن کی جاذبیت اور کیف انگیزی کا کیا ٹھکانہ! یہی وجہ ہے کہ ہر ایک مسلمان اپنے آپ کو عاشقِ رسولؐ کہتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ مگر عوام تو عوام کیا خواص میں بھی عشقِ رسولؐ کے تقاضوں کو پورا کرنے والے موجود ہیں؟ جس کو دیکھئے اپنے ذاتی نظریات پر لوٹ ہے۔ یا خود غرض رہنماؤں کے پیچھے چلنے کو دین و ایمان سمجھتا ہے۔ مگر جب جذباتِ نفس و محبوباتِ طبیعت کے ترک کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو کتنے ہیں جو رسول اللہ کی خوشنودی کے لئے خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں؟ حضورؐ نے جو کتاب ہم کو دی تھی وہ زندہ و پائندہ کتاب ہے۔ غیر فانی، غیر متبدل، ابدی حقائق و زندہ جاوید حکمتوں کا خزانہ۔ جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑ کر جاتا ہوں، قرآنِ کریم اور میری سنّت۔ اگر دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہے تو دین اور دنیا سعادتیں تم پر نچھاور ہوتی رہیں گی لیکن قرآنِ حکیم کی آیات کو ہم نے اپنی خواہشاتِ نفس کے تقاضوں سے ہمآہنگ و تاویلات نہیں بنایا؟ اور یہ کام عوام کا نہیں خواص کا ہے بلکہ ان خواص کا جو متبعین اور عقیدت مندوں کا ایک ایک لشکر اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جن کی زبان پر ہر وقت قرآنِ کریم کی ہی آیات رہتی ہیں جو تاویلات کے ذریعہ اپنے پیروانِ سادہ لوح کو

سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔

ہم ذیل میں اقبالؔ کے ایک خط کا ضروری اقتباس درج کرتے ہیں جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی مرحوم کو اُس زمانے میں لکھا تھا جب ان کی کتاب "اسرارِ خودی" کے خلاف طوفانِ بدتمیزی اُٹھ رہا تھا۔ اس اقتباس سے ایسے قرآن دشمن لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اقبالؔ کو بے عمل کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"میری نسبت آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے۔ اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی "وحدۃ الوجود" کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مگر قرآنِ کریم تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ دریں نے محض قرآن مجید کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔ اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دینی اور قلبی جہاد کرنا پڑا[1]

جو لوگ دین کی مخالفت، قوم میں فساد و انتشار کی تخم ریزی اور اپنے عمل ہی سے نہیں اپنی زبان و قلم سے بھی برملا اسلام کی مذمت اور اس کی تعلیمات کا تمسخر کرتے رہتے ہیں کیا ایسے لوگوں سے ہماری دوستیاں اور رشتہ داریوں میں کبھی فرق آیا؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص ہماری ذات کو برا کہتا ہے۔ ہم پر تنقید کرتا ہے خواہ وہ تنقید

---

[1] مکاتیبِ اقبالؔ۔

صحیح ہو تو کیا، ایسے شخص کے ساتھ بھی ہمارے تعلقاتِ مہر و محبت قائم رہتے ہیں؟ مگر اقبالؒ نے اپنی تمام زندگی میں ذاتی بنا پر کسی کو ایسی بات بھی نہ ان سے نہیں کہی جو اس کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ جن لوگوں نے ان کی مذمت کی، اُن پر اتہام لگائے۔ اور اس طرح اُن کی شدید سے شدید دل آزاری کی، اقبالؒ نے اُن کے لئے بھی کوئی ناریبا کلمہ از بان نہیں نکالا۔ مگر قوم کی خاطر اور اسلام کے لئے ایک لمحہ بھی کسی غلط بات کو برداشت نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے حق بات کہنا اپنا فرض سمجھا۔ حافظ شیرازیؒ کے خیالات کو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر نقصان رساں سمجھا تو ان پر بے لاگ تبصرہ کیا۔

جب مولانا حسین احمد مدنیؒ مرحوم نے یہ فرمانا شروع کیا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت بنالیں" تو اس پر علامہ اقبالؒ کو بڑا افسوس ہوا کہ حسین احمد مدنی جیسے عالم دین کا یہ حال ہے تو اس اُمتِ مسلمہ کا کیا ہونا ہے حالانکہ قومیتِ مسلم کی بنیاد نہ وطن اور نہ زبان ہے نہ رنگ و نسل بلکہ کلمۂ توحید ہے۔ اقبالؒ نے مولانا کی شخصیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک فارسی قطعہ لکھا، اور چونکہ اتنی بڑی شخصیت نے مسلمانوں کو ایسا غلط مشورہ دیا تھا جس سے مسلمانوں کی تحریکِ قومیت کو ہر وقت نقصان پہنچے اور مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فتنے کے اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے قطعہ کا لب و لہجہ نہایت تند و تیز اختیار کیا۔

قطعہ یہ ہے ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منزل کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست!
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اسی طرح اقبالؔ نے بانیِ تحریکِ احمدیت کے خلاف بھی اسی قدر مدلل اور پُرزور انداز میں لکھا کہ قادنیت کے ایوانِ الحاد میں زلزلہ آگیا۔ اور نئے تعلیم یافتہ، جو اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے، اور عوام، جو اخلاص کے سبب سے، قادیانیوں کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو رہے تھے ایک دم ٹھٹک کر رہ گئے۔ اور دام کو دام سمجھ لیا۔ اگرچہ دام ہمرنگِ زمین تھا۔ ہم ذیل میں اقبالؔ کے اُس انگریزی مضمون کے اُردو ترجمے سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جو انھوں نے ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضمون شائع ہونے کے بعد جواباً لکھا تھا۔

"میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادنیت کے متعلق جو بیان دیا تھا، جس میں ایک مذہبی نظریے کی محض جدید اصولوں کے مطابق تشریح کی گئی تھی، جس سے ہم اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل دیا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خودمختاری پیدا ہو۔"[1]

"یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی شعور کی ترقی

---

[1] مضامینِ اقبالؔ صفحہ ۱۴۷ - ۱۴۶

سے اُن کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب کی اُمت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی اُمت تیار کر دیں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں اس میں ان کا انارکی استحکام کس قدر ضروری ہے۔ اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، اور یہ موقع دیتی ہیں کہ ایسی تحریکوں (احمدیت) سے ہمدردی کریں۔"

"یہ سوال کہ الحاد کبیرہ کس کو کہتے ہیں، اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم مذہب اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔"

"ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے حق بالکل سلیم ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آزادی کا راستہ دکھایا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم، جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی ایسے الہام کا

حامل تھا۔ لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیٔ احمدیت کا استدلال، جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لئے زیبا ہو سکتا تھا، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا کر سکے تو پیغمبرِ اسلامؐ کی رُوحانیت نامکمل رہ جائیگی۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی رُوحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اُس سے پھر دریافت کریں کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی نہیں میں آخری نبی ہوں۔"

"غرضکہ جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اس کے دعوائے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی رُوحانیت کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریکِ احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلامؐ کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے رُوحانی مُورث کی ختمِ نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔" [1]

"بانیٔ احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا مؤثر طریقہ ہوگا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانیٔ احمدیت کے.....

---

[1] مضامینِ اقبال صفحہ ۵۵ - ۱۵۴

بہائیات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اُس میں نفسیاتی تحقیق کے لئے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بابی احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی بنی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیات جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا۔ اگر وہ قرآن کریم کو اپنا معیار قرار دے اور چند وجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی، اور اپنے مطالعہ کو بابی احمدیت اور اس کے ہم عصر غیر مسلم صوفیاء، جیسے رام کرشنا پرمہنس کے تجربوں تک پھیلائے گا۔ تو اس کو اس تجزیہ کی اصلی ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی جس کی بنا پر بابی احمدیت نبوت کا دعوے دار ہے۔" [1]

"پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈراما میں حصہ لیا ہے۔ زوال اور انحطاط کے باعث ہیں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈراما کھیلا گیا تھا۔ لیکن اس میں وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا ہے اور بابیوں کو اجازت دی کہ اپنا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی۔ اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز اوکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لئے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان

---

[1] مضامین اقبال صفحہ ۱۵۸ - ۱۵۷

نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعتِ نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے لیکن اسلام کی اُس ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقینِ کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک صاف ہو کر نکلے گا۔"[1]

بہر حال عشقِ رسولؐ کا راستہ اتنا مختصر اور آسان نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ جب کسی کے نام سے محمدؐ سنا تو سر جھکا دیا۔ یا انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگا لیں۔ یا میلاد کے جلسوں میں زحمتِ شرکت گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ ذکرِ ولادت کے وقت تعظیماً کھڑے ہو گئے! عشقِ رسولؐ اپنے ساتھ بہت سے تقاضے رکھتا ہے۔ اور انہیں تقاضوں کے پورا کرنے کا نام عشق ہے۔ اقبالؔ کے متعلق جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے یہ عجیب و غریب باتیں انہیں ہیں۔ ایک عاشقِ رسولؐ کا یہی کام ہونا چاہیئے۔ وہ عاشقِ رسولؐ تھے اور یہ باتیں اُن سے بتقاضائے عشق ظہور میں آتی رہی ہیں۔ ملت کی خاطر جو انہوں نے ذہنی و فکری جہاد کیا ہے کم نہیں ہے۔ عوام جان و مال ہی کی قربانی کو قربانی سمجھتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ طبیعت، عادت اور خواہشاتِ نفس کی قربانی کس قدر مشکل مگر کتنا بلند مقام رکھتی ہے۔ کسی نے مولانا رومؒ سے ایک ایسے زہد کی تعریف کی جس نے دنیا اور اس کی لذتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ تو مولانا نے فرمایا تھا کہ "کاش کردے و در گذشتے"۔ اصل میں مردانِ خدا اور عاشقانِ رسولؐ وہی ہیں جو

---

[1] مضامینِ اقبالؔ صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۲

عمر بھر کی عادت کو بھی خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔
ہم صرف دو واقعے نقل کرتے ہیں جن سے قوم کی خاطر ان کی مال دولت بلکہ اپنے ذاتی مقصد سے بے پروائی اور قوم کی اصلاح کے لئے اپنی دیرینہ روش کو خیرباد کہہ کر وہ روش اختیار کرنا معلوم ہوگا جو حضور اکرمؐ کا اتباع ہونے کی وجہ سے، حضور اکرمؐ کی خوشنودی کا باعث ہو سکتی ہے۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ مرحوم نادر شاہ جب لاہور کے راستہ سے افغانستان جا رہے تھے تو اقبالؔ بھی اسٹیشن پر اُن سے ملنے گئے۔ اور محض ملنے ہی نہیں گئے بلکہ پانچ ہزار روپے کی پیش کش بھی کرنی چاہی۔ حالانکہ یہ روپیہ اُنہوں نے اپنے کسی خاص مقصد کے لئے جمع کیا تھا۔ مگر یہ کہتے ہوئے کہ وہ میرا ذاتی اور انفرادی مقصد ہے اور جس کے لئے آپ جا رہے ہیں یہ ملّتِ اسلامیہ کا اجتماعی مقصد ہے۔ اس لئے کہ ملّت افاغنہ کی آزادی و ترقّی کے لئے ضروری ہے، پیش کش کے قبول کرنے پر اصرار کیا۔

دوسرا واقعہ۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ اقبالؔ کا ایک مضمون "جنابِ رسالت مآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ" کے عنوان سے ۱۳۴۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ جو کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیال کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانے میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا

ادب اُن کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے۔ اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی نہ ہونی چاہیئے اور کیسی ہونی چاہیئے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جسے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ٹوک طرح حل کیا ہے:۔

"اِمرُءُ القیس نے اسلام سے (۴۰) سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی تھی۔

"اَشعَرُ الشعراءِ وقائدہم الی النار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے مرحلے میں اُن کا سپہ سالار بھی ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات سے یہ رائے ظاہر کرائی۔ امرء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے زور، عشق و حسن کی ہوس ربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اُڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مٹیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہی عرب کے دورِ .... جاہلیت کی کل کائنات ہے۔ امرء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے۔ اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر

بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی اچھا شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت و قوت کی تصویر بنا کر دکھائے اور اس طرح قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اُٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی چھیا لے۔"

"ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا:

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ حتی اناں بہ کریم المأکل

(ترجمہ) "میں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ اکل حلال کے قابل ہو سکوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جن کی بعثت کا مقصد و حید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں۔ اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آئندہ اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"۔

"اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا لاکھوں گیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ عرب نے اپنے شعر میں اس کی گوں کی بات

کہی تھی :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے حال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دو جہاں (بانیٔ اُمت و اُمّی) نے جس قدر اس شعر کی تعریف فرمائی ہے اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے، اُس پر فوقیت نہیں رکھتی۔" [1]

یہ ۱۳۴۱ھ کا مضمون ہے اور دنیا جانتی ہے کہ اُس زمانے سے پہلے خود اقبالؔ کی شاعری کا انداز کیا تھا؟ غزل گوئی سے شاعری کا آغاز ہوا، ارشدؔ گورگانی اور مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی، اور داغؔ کے طرز میں غزلیں کہیں غالبؔ کا تتبع کیا تو ان کے انداز میں لکھا۔ اس کے بعد مناظرِ قدرت کی عکاسی اور ہندوستانی وطنیت اور ہندی قومیت پر معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں۔ اور یہی موضوعات ایک مدت تک اُن کی جولانگاہِ فکر رہے۔ چنانچہ بانگِ درا، جو اُن کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے، اور اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہے، تقریباً اسی قسم کے خیالات کا مجموعہ ہے، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، جب انہوں نے قرآنِ کریم کا بغور مطالعہ کیا، اور حضور پر کرم کو پہچانا تو حضورؐ کے عشق میں وہ تمام موضوعات یک قلم ترک کر دیئے اور پھر اپنی شاعری کو اسی معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کی جو مضمون بالا کے ذریعہ قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حافظ شیرازیؔ کے خیالات پر سخت تنقید کی اور جب لوگوں کے اصرار پر اُن اشعار کو دوسرے

---

[1] رسالہ ترقی دکن، بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ صفحہ ۲۰۲

ایڈیشن سے خارج کیا تب بھی ان کی بجائے جو بات شامل کتاب کیا اس میں بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے جو اپنے مضمون میں بیان کئے تھے۔ غرض کہ اپنی شاعری کی روح بدلنے اور اس کو حضورؐ کے ادبی تبصرے کے مطابق حیات آفریں بنانے میں ان کو اپنی طبیعت کے خلاف معمولی جہاد کرنا پڑا ہوگا۔ مگر محبت میں آدمی سب کچھ کرتا ہے اور ہر جفا و رغبت کرتا ہے ؏

عشق بدوش می کشد این ہمہ کوہسار را

ہم نے دیکھا ہے کہ شاعری کی جو زمین کسی کے پیروں کو لگ جاتی ہے وہ پھر عمر بھر اُس سے باہر قدم نہیں رکھتا۔ الا ماشاء اللہ۔ مگر اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ و بدولت ان تمام دیرینہ طریقوں کو ترک کر کے عمر بھر اسلام ہی کی ترجمانی کی۔ جیسا کہ "التماس بحضور رحمۃ اللعالمین" میں عرض کیا ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — در بحر فم غیر قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور — چشم تو جیندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہل ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن — بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگور من — زہر ریز اندر مئے کافور من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از لوحۂ پاکن مرا
در دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایک از احسانِ تو ناکس کس است — یک ز عالیت مزد گفتارم بس است
غزنوی کن پیش خدائے عز و جل — عشق من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ — بہرۂ از علم دیں بخشیدۂ

در عمل پابندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

جس کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے وہ مسلمان ہے اور قوم سے محبت نہ ہو اس لئے کہ حضورؐ کو قوم بہت زیادہ عزیز تھی۔ آج جو ہم اپنے نفس کی ادنیٰ خواہش پر قوم کے بڑے سے بڑے مقصد کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہمارے دل حضورؐ کی محبت سے خالی ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم ہر وقت قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتا نہ کہ اپنے نفس کے لئے۔ اقبالؔ نے صاف کہہ دیا ہے کہ ان کو قوم سے اس لئے محبت ہے کہ وہ ان کے محبوب (سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبوب ہے۔ قوم سے خطاب کرتے ہیں کہ ؎

زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی
ہمچو دل اندر کنارِ ماستی

اقبالؔ اور دوسرے نعت گو شاعر

اقبالؔ سے پہلے شعراؔ نے حضورِ سرورِ کائناتؐ کی تعریف کا وہ انداز اختیار کیا ہے جو دنیاوی حسینوں کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کا سراپا لکھتے ہیں زورِ قلم و پروازِ فکر کے کمالات دکھاتے تھے یا غزل کے رنگ میں حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف کرتے تھے۔ اور اسی نہج پر وصال و فراق کی وارداتیں لکھتے تھے۔ اور جن شعراء نے ایسا نہیں کیا انہوں نے بھی جو تعریف و ثنا کی ہے وہ نہایت محدود اور ناتمام انداز میں کی ہے۔ مثلاً معراج کے بیان پر اپنی فکری صلاحیتوں اور زورِ طبع کو صرف کیا ہے۔ حضورؐ کے محامد و فضائل میں سے شفیع المذنبین ہونے کی صفت کو زیادہ سے زیادہ دہرایا ہے یا معجزات کو شرح و بسط کے

سالخوردہ ہو رہے اور اس میں اپنی طرف سے لطیف و شگفتہ بیانی کی ہیں ۔
حضورؐ کی جناب میں التماس و عرض حال ہے تو اپنے ہی حسب کار ہی کا۔ اور حضورؐ
سے شفاعت کی درخواست کی ہے تو اپنے ہی لئے۔ دُعا درد کار و زار رو یا ہے اور
بیدار مال کلب کی ہے تو اپنے لئے۔ لیکن حضورؐ نے اس گناہوں سے معمور
دنیا کو کیسا سے کیسا کر دیا تھا، اس معاصرے کو جو دنیا جہان کی گندگیوں
اٹا ہوا تھا کیسا پاکیزہ اور کتنا ارفع و اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اس تاریکی
باتوں کو جس میں انسان کو خود اور سب کچھ نظر آتا ہو مگر اپنا مقام مطلق
نظر نہ آتا تھا۔ اپنے انوار کی ضیا پاشیوں سے کیسا روشن و تابناک
بنا دیا تھا کہ انسان نے سب سے پہلے اپنے آپ ہی کو دیکھا اور ایسا
دیکھا کہ اپنے حسن و جمال کا عاشق ہو گیا۔ پھر یہ کہ دنیا کی کس طرح
ریختہ کی، زندگی کے کس شعبے میں کیا اصلاحات کیں وغیرہ ۔
ان باتوں کا جامع و مانع بیان ایک طرف، اجمالی تذکرہ بھی کسی نے
نہیں کیا۔ حضورؐ کے اصحاب کی طاعت خدا اور رسولؐ کا ورد فردسی
اسلام کا بیان کسی نے بھی نہیں کیا۔ اور اسی طرح کسی نے اپنے ساتھ قوم
کی طرف التفات فرمانے کی درخواست بھی نہیں کی۔ اس میں شک نہیں
کہ بعض اشعار تلاش کرنے سے ایسے بھی نکل آتے ہیں جن میں اس مذکورہ
صدر حدود طریقے سے ہٹ کر بھی کچھ کہا گیا ہے۔ تو وہ اول تو الشاذ
کالمعدوم کے حکم میں آتے ہیں دوم ان میں بھی یہ تفصیل و توضیح اور یہ
دلنشینی کہاں ہے جو اقبال کے اشعار میں پائی جاتی ہے اور پھر بھی ایک چیز
سرے سے ہی مفقود ہے۔ یعنی تصورِ "امت" کسی کے ہاں بھی نہیں ملتا۔
بہرحال ہم دوسرے شعرا کے ایسے اشعار تلاش کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ
ناظرین کرام خود اندازہ کر سکیں کہ اقبال نے جو حضورؐ کے اوصاف بیان
کئے ہیں اور ان شعراء کے بیان میں کتنا فرق ہے ۔

حکیم سنائی

آمد اندر جہانِ جاں ہر کس
جانِ جانہا محمدؐ آمد و بس

دُنیا میں آنے کو سبھی آئے ہیں۔ مگر جہان کی جان بن کر محمدؐ ہی آئے ہیں۔ یعنی عالمِ بشریت، جس پر اخلاقی و رُوحانی موت طاری ہو چکی تھی، آپ کے دم سے زندہ ہو گیا۔

عالم جزو را نظام بدو
غرض نفس کل تمام بدو

نفسِ کُل (خدا تعالیٰ) کے مقصد کی آپ نے تکمیل کی۔ یعنی اس عالم جزویات (دنیا) کا اپنی شریعت کے ذریعہ ایسا انتظام کیا کہ چشم فلک ایسا عالم اب نہیں دیکھ سکے گی۔

آمد از رب سوئے زمینِ عرب
چشمۂ زندگانی اندر لب

آپ دنیا میں اس شان سے تشریف فرما ہوئے کہ دم توڑتی ہوئی انسانیت آپ کے لبِ جاں بخش کے ذریعہ حیاتِ تازہ سے بہرہ اندوز ہو گئی۔

تیغ و قرآں در اشدہ معجز
نشود شرع او خلق ہرگز

آپ کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر آئے۔ کہ قرآنِ کریم کی تعلیم سے انسان کی اصلاحِ اخلاق کریں۔ اور اگر کوئی طاقت اس کام سے آپ کو باز رکھنے کے لئے تلوار سے کام لے تو تلوار کا جواب تلوار ہی سے دیا جائے۔

زحمتِ آب و گل دریں عالم
رحمتش نام کردہ فضلِ قدیم

ترکِ دنیا جو آب و گل کے تقاضوں سے بیزار ہو کر کی جاتی تھی۔ اور اس کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا آپ نے ان ہی تقاضوں اور اُن کی تکمیل میں جو زحمت اُٹھانی پڑتی ہے اس کو فضلِ خدا سے تعبیر فرمایا۔ اور یہ دنیا پر آپ کی بہت بڑی رحمت ہے مگر ان تقاضوں کو اللہ کے حکم کے مطابق پورا کرنے کی تعلیم دی ہے ورنہ زحمت کی بجائے رحمت نہیں بن سکتے۔

اے سنائی گر ہمیں جوئی ز لطفِ حق سن — عقل را قرباں کن اندر بارگاہِ مصطفےٰ
ہیچ مندیش از چنیں عیار ابلیس بود — ماقیِ عقلِ ترا ایمان و سنت خوں بہا
مصطفےٰ اندر جہاں آنگہ کسے گوید کہ عقل — آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید ضیا

حضورؐ کے ہوتے ہوئے عقل ظاہر کی پیروی کرنا ایسا ہی مضحکہ کام ہے جیسے کوئی آفتاب کی موجودگی میں شمع جو ایک چھوٹا ستارہ ہے کا طلب گار ہو۔

رحمۃ للعالمین آمد طبیبت زو طلب
چہ ازیں عاصی و زاں عاصی ہمی جوئی شفا

تمہارے طبیب رحمۃ للعالمین ہیں۔ شفا اُن سے طلب کرو۔ دنیا کے فلاسفر و حکما جو خود مریض ہیں۔ (مریضِ عصیاں) وہ تمہیں کیا شفا بخش سکتے ہیں۔ ان کی تعلیمات سے تو تمہاری بیماری حسن و تمنن میں اور اضافہ ہوگا۔

کاں نجات و آں شفا کار بابِ سنت جستہ اند — بوعلی سینا ندارد در نجات و در شفا
داشتا نزدیک او خوز آنکہ خود نبود طبیب — مقنیِ ذوق و دلیلِ نبض جز در ناشفا

اپنے طبیب (حضورِ اکرمؐ) کے پاس جاؤ تو بہار رشتہ جاؤ اس لئے کہ نہیں مرتب

کی شناخت نہار منہ بھی ہوا کرتی ہے۔ یعنی آپؐ کی تعلیمات کا مطالعہ کرو تو خلوصِ دل کے ساتھ کرو۔ حکمت و فلسفہ کی عینک اپنی آنکھوں پر لگا کر آپؐ کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ آنکھوں پر جس رنگ کی عینک لگاؤ گے ہر چیز اسی رنگ میں نظر آئے گی۔

شیخ فریدالدین عطارؒ:۔

خواجۂ دنیا و دیں گنجِ وفا — صدر و بدرِ ہر دو عالم مصطفیٰؐ
آفرینش را جز او مقصود نیست — پاک دامن تر از و موجود نیست
گشت او مبعوث تا روزِ شمار — از برائے کلِ خلق و روزگار
ختم کردہ حق نبوت را بدو — معجز و خلق و فتوت را بدو
دعوتش فرمودہ بہر خاص و عام — نعمتِ خود را بدو کردہ تمام
چار یار با حق زبان اوست بس — بہترین عہدے زمانِ اوست بس
وصف او کے لائق این ناکس است — واصفِ و خالقِ عالم بس است

یا رسول اللہ بسے درماندہ ام — با دو رکف خاک بر سر ماندہ ام
وارد دے در دلِ من مہر تست — نور جانم آفتابِ چہر تست
زیں ہمہ پندار و خاشاک ترہات — پاک گردانی مرا اے پاک ذات

مولانا رومؒ:۔

یا رسول اللہ حبیبِ خالقِ یکتا توئی — برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی
تا زغیرت حضرتِ حق، صدرِ بزمِ کائنات — نورِ چشمِ انبیاء، چشم و چراغِ ما توئی

یا رسول اللہ تو دانی اُمتانت عاجزاند　　عاجزاں را رہنما و پیشوا ے تو ئی

زاں محمدؐ شافعِ ہر داغ بود　　کز سرِ مہ چشمِ او ما زاغ بود
از اُمِ شرح دو چشمش سُرمہ یافت　　دیدہ چہ جبرئیل آں بزشاوت
گر بگویم تا قیامت نعمتِ او　　ہیچ امد را مقطع و غایت نجو

"مثنوی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ابوجہل نے آنحضرتؐ کو دیکھ کر کہا (نعوذ باللہ) بنی ہاشم میں ایسا بدصورت شخص پیدا نہیں ہوا۔ فرمایا تو سچ کہتا ہے۔ اتنے میں حضرت صدیق اکبرؓ آئے اور عرض کیا کہ اے آفتابؐ! دو عالم تیرے نور سے منور ہیں۔ ارشاد ہوا تم ٹھیک کہتے ہو۔ حاضرین نے اس کی وجہ پوچھی تو :۔

گفت من آئینہ ام مقبولِ دوست
ترک و ہندو در من آں بیند کہ اوست

"یعنی میں خدا کا صیقل کیا ہوا آئینہ ہوں۔ جس میں ہر کوئی اپنی صورت دیکھتا ہے۔ [1]

مولانا نظامی گنجویؒ :۔

راہ روانِ عربی را تو ماہ
یادگیانِ عجمی را تو شاہ

---

[1] فاران سیرت نمبر صفحہ ۲۹۱

عالم تر دامن خشک از تو یافت
نافِ زمیں نافۂ مشک از تو یافت

دنیا کا دامن معصیت آپ ہی کے ابرِ کرم سے پاک ہوا۔ اور مکہ جو نافِ زمین ہے، آپ ہی کی بدولت طہارت و پاکیزگی سے مالا مال ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی خوشبو نے ایک عالم کے مشامِ جاں کو معطر کر دیا۔

از اثرِ خاکِ تو مشکیں غبار
پیکرِ آں قوم شدہ مشک بار

یہی نہیں کہ آپؐ کی تعلیم سے ان کے اخلاق پاکیزہ ہو گئے بلکہ ان کے اخلاق کی خوشبو نے دوسروں کو بھی متاثر کر دیا۔ دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو گئے۔

خاکِ ذلیلاں شدہ گلشن بتو — چشمِ عزیزاں شدہ روشن بتو
حقلِ شفا جوئے و طبیبش توئی — ماہِ سفر ساز و غریبش توئی

اے مدنی برقع و مکی نقاب — سایہ نشیں چند بود آفتاب
منتظراں را بلب آمد نفس — اے ز تو فریاد بفریاد رس
خاکِ تو بوئے بولایت سپرد — بادِ نفاق آمد و آں بوئے برد
بازکش ایں مسند از آسودگاں — غسل دہ ایں منبر از آلودگاں
خانۂ غولند بپرداز شاں — در خلد دانِ عدم انداز شاں
ما ہمہ سیم بیا جانِ تو باش — ما ہمہ دیوئیم سلیماں تو باش
از طرفے رخنۂ دیں می کنند — وز دگر اطراف کمیں می کنند
یا علیؓ در صفِ میداں فرست — یا عمرؓے بر سرِ شیطاں فرست

راحت این خانۂ آفت پذیر! دست برآور ہمہ را دست گیر!
ہر چہ رضائے تو بہ جز راست نیست با تو کسے را سر و اخواست نیست
گر نظر از راہِ عنایت کنی جملہ مہمات کفایت کنی

جس بات میں آپ کی خوشنودی شامل ہو وہی درست ہے۔ اس لئے جو آپ کے ساتھ ہے اس کو مواخذۂ روزِ حشر کا کوئی اندیشہ نہیں۔

یتیماں را نوازش در نسیمش از ینجا نام شد دُرِّ یتیمش
بمعنی کیمیائے خاکِ آدم بصورت توتیائے چشمِ عالم
سماسِ حدِّ او ختمِ جہاں است شریعتہا باو منسوخ ازاں است

آپؐ خاتم النبیین ہیں۔ اب قیامت تک کوئی اور نبی نہ ہوگا۔ دین مکمّل ہو گیا۔ اور تمام نعمتیں آپؐ پر ختم ہو گئیں۔ اس لئے ماسبق تمام ... شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ تمام انبیائے سابقین اسلام ہی کی تعلیم دینے آئے تھے۔ مگر محدود جگہ محدود وقت اور خاص خاص قوموں کے لئے آئے اور حضورؐ ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے۔ آپؐ کی تعلیم ہر قوم، ہر جگہ اور قیامت تک ہر زمانہ کے لئے ہے۔ اور مکمّل ہے اس لئے پہلی شریعتوں کی اب ضرورت نہ رہی۔ جس طرح آفتاب کے نکل آنے پر ستاروں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

چراغے کہ پرواز بینش بدوست فروغِ ہمہ آفرینش بدوست
چراغے کہ تا او نیفروخت نور ز چشمِ جہاں روشن بود دور
سیاہی دہِ خالِ عبّاسیاں سپیدی دہِ چشمِ شماسیاں
محیطے چہ گویم، چو بارندہ میغ بیکدست گوہر بیکدست تیغ
بہ گوہر، جہاں را بیاراستہ بہ تیغ، از جہاں دادِ دیں خواستہ

حضورؐ کی ذاتِ گرامی ایسا چراغ ہے کہ ہیسانی کی جلا جلہ تمام عالم کی روشنی اس کی وجہ سے ہے۔ جب تک یہ چراغ روشن نہیں ہوا تھا دنیا کی آنکھیں روشنی سے محروم تھیں۔ عباسیوں کے خال کی سیاہی (خوبصورتی) اور شماسیوں کی آنکھ کا نور اسی کی بدولت تھا۔ اس کو سمندر کس طرح [illegible] وہ ایسا برسنے والا بادل ہے۔ جس کے ایک ہاتھ میں موتی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ موتی (تعلیم شریعت) سے جہاں کو آراستہ کیا۔ اور تلوار کے ذریعہ دنیا سے دادِ دین حاصل کی۔ دنیا بھر کو دین کا تابع بنا دیا۔

خاقانی شروانی:۔

در دار الملک سرِّ قرآں — خطبہ ابدی بنام او داد
ایزد کہ قسم بہ جانش خوردہ — سجادہ اش ادیم خاک کردہ
خیمہ زدہ شرع در جنابش — حبل اللہ المتین طنابش

دنیا کہ دو روزہ کاخ و کوخ است
در راہِ محمدی کلوخ است

قرآن مجید کا آخری پیغام ہے۔ اور ابدی ہے۔ اسی قرآن مجید نے آپؐ کو آخری نبی کہا ہے یعنی اب قیامت تک کوئی نبی نہ ہوگا۔

اللہ نے، جو قسم آنِ کریم میں آپؐ کی جان کی قسم کھاتا ہے وہی آپؐ کے لئے روئے زمین کو مسجد قرار دیتا ہے یعنی مسلمان ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ جگہ پاک ہو۔

آپؐ کی شرع کی مثال ایک خیمہ کی سی ہے۔ مگر ایسا خیمہ کہ خدا کی رسی (شریعت)، جس کی طناب ہے۔

. . . . . .

بر ذنب جز دوزخ ہے۔ راہِ محمدؐ میں سنگ کا کام کرتی ہے یعنی جو شخص دنیا کا دلدادہ ہو گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ سے دور ہو گیا۔ دنیا میں رہنا اور ہے اور دنیا کا ہو لینا اور۔ دنیا کا ہو لینا مذموم ہے۔

بر آستانِ کعبہ مصفا کنم ضمیر
زو نعتِ مصطفیٰ ئے مزکا بر آورم

آستانِ کعبہ پر رو رو کر صفا نے دل حاصل کروں گا اور پھر پاک و مطہر نبی کی تعریف کروں گا۔

دیباچہ سراچہ کل، سرورِ رسل
کز خدمتش مرادِ مہنا بر آورم

تمام موجودات کے لئے حضورؐ کی ذات دیباچہ کا حکم رکھتی ہے (اوّل ما خلق اللہ نوری کے اعتبار سے) اور آپؐ تمام رسولوں کے سردار ہیں۔ میں آپؐ کی خدمت (نعت لکھنے) سے اپنی محبوب مرادیں حاصل کروں گا۔

کے باشد آں زماں کہ رسم باز حضرتش
فریاد یا مغیث اغثنا بر آورم

وہ وقت کب دیکھنا نصیب ہو گا کہ جب آپؐ کے آستانے پر باریاب ہو کر "یا مغیث اغثنا" کا نعرہ لگاؤں گا۔ کہ اے فریاد رس میری فریاد سنئے۔

از مشارقِ بولہب فعلاں نہ پیچیا م عنان
چوں رکابِ مصطفیٰؐ شد مقصد و ماوائے من

جب کہ میں نے رکابِ مصطفیٰؐ تھام لی ہے تو اب ان بولہب کردار رشتہ دار

نے شہد نہیں چھپ سکتا۔ یہ تجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتے۔

قاسم رحمت ابوالقاسم رسول اللہ ہست

در دلائے او خدا پر عقل و جاں ولا ہست

وہ قاسم رحمت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی محبت کی وجہ سے عقل و جان لرجواب ہیں۔ یہ ملک میں بادشاہ ہیں۔ میرے غلام ہو گئے ہیں۔ عقل بھی میرے قابو ہے۔ روح بھی۔ اور محبت رسول کا شہرت ہی ہے کہ انسان تابع عقل و نفس ہو جائے گی جائے عقل و نفس کو حضور کی مرضی کے تابع کر دے۔

در ملک تو عقل بے تدبیر است — در بزم تو روح باشقی گیر

پیکر من تو صورت بے کار است — بر چیز صدائے الا اللہ است

شیخ مصلح کی تیمارداری:۔

بلغ العلیٰ بکمالہ — کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ — صلوا علیہ وآلہ

بر غم دو راست راہ در چوں آویختیاں

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں

[illegible] — [illegible] الامم

امام [illegible] — امین خدا [illegible] شیاں

[illegible] — [illegible] شہست

[illegible] — [illegible]

مند لعصیاں کے در لرو بدار دینیں سیدِ پیشرو

حضرت امیر خسرو رح :-

[illegible] تقی [illegible] جب متیں نسخہ منشورِ او

[illegible] سینہ چناں [illegible] باشد تنیں

آپ نے [illegible] پہلو گروہ و تقی [illegible] اور آپ کا نسخہ منشور قرآن کریم ۔
جب [illegible] آپ کے [illegible] پناہ لی گویا اس کو گروہ و تقی مل گیا
[illegible] نے قرآن [illegible] کیا اس نے اللہ کی مضبوط رسی تھام لی ۔ آپ کے در
[illegible] ہے [illegible] ہدایت [illegible] ہے ۔ کس قدر نازک دل کتنا [illegible]
اپنے اوپر لئے ہوئے ہے ۔

[illegible] امت [illegible] [illegible] آمرزگار
[illegible] آزادی خاص است و عام [illegible] رسالت تمام
[illegible] فتنہ [illegible] علم [illegible]

باد ہمیشہ رہِ ما سوئے او
سرمہ ما [illegible] سرِ کوئے او

[illegible] تیغ [illegible] کلیم گوہر [illegible] تیغ تو کردی پدید
[illegible] رحمت کشاد چشم تو در [illegible] احسان کشاد
[illegible] [illegible] جاست جان [illegible] چو لیسین جاست
[illegible] تو [illegible] ظل لوائے تو پناہِ ہمہ
[illegible] طرازِ تو [illegible]
نقدِ دو عالم بترازو نہاد

مولانا جامیؒ:-

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
رفتہ ز دستیم، بروں کن ز برد — دستے و بنمائے یکے دستبرد
برقِ فراقت چو جہاں سوز شد — مشعلِ یارانِ شب افروز شد
مشعلِ شاں چرخ چو بے نور کرد — صبحِ بدی را شبِ دیجور کرد
ظلمتِ بدعت ہمہ عالم گرفت
بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

کاش فتد اوج عروجت رجوع — باز کند نورِ جہانت طلوع
دیدۂ عالم بتو روشن شود — گلخنِ گیتی بتو گلشن شود

ز بستانِ وفا آزادِ سروے — ز باغِ اصطفا رعنا شدروے
اگرچہ نور شد ز دو چشم ہر خام — چو سرمہ ساخت روشن چشمِ اسلام
پئے دیوارِ ایماں بود کارش — ولے شد پائدار از چار بارش
کجا در راہِ دیں درد آزمائے — کہ تا یابد بہ ہر دردے دوائے

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی — ز مہجوری ماں چرا غافل نشینی
ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز — چو نرگس خواب چند از خواب برخیز
بروں آور سر از برِ دیبائی — کہ روئے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہ ما را روز گرداں — نمودیت روزِ ما فیروز گرداں

تو ابرِ رحمتی کہ بہ گیتی گاہے — کنی ہر ہائے سب خشکان نگاہے

ز خوانِ عام تو ہر کس گرفتہ بہرۂ خاص — بقدرِ مرتبۂ خویشتن چہ خاص و چہ عام
ز فیضِ احترامِ تو جامی مدام جرعہ کش است — بے انصیب بود خاک راز کامِ کرام

خسرو شیرازی

آرا بشہ عالیوانِ نبوت کہ ز تعظیم
خاکِ درِ او افسرِ شرف داد قسم را

نہ نام ترا افسرِ فہرست نہ کردند — شیرازۂ مجموعہ نہ بستند کرم را

سایہ یزدانی و انوارِ سحابت دلیل — داور کونینی و الوانِ احسانت سپاہ
بسکہ زدست رحمتت راستش ہر چہ کرد — عشق می ورزد بحسنِ یاس و امید اشتباہ
ز خیالِ ہیبت اندیشہ میرد در ضمیر — وز نشانِ آستانت سجدہ قصد در جباہ

اے مہ جہان آفرینش — نعتِ تو زبانِ آفرینش
لطفِ تو چمن طرازِ امکان — خشمِ تو خزانِ آفرینش
معراجِ تو در ہوائے لاہوت — حدِ طیرانِ آفرینش

شہنشاہے کہ بست از نہایت درویشی و ہمت
وجودِ خود فراموش و غمِ عالم فرا دانش

اے کہ زقت گذارش پیغام — بہر بزرگت فرستادی
گمرہاں را بہ ظلمت غفلت — چراغ شمع فن فرستادی
دوجہاں را ز راہ حکمت و عدل — تحفہ ہا ز عطا فرستادی

فیضی :-

مشعل نہ پیش گاہ اقرار
آتش زن دودمان انکار

آپ اقرار کرنے والوں (مومنوں) کے سامنے مشعل ہدایت رکھنے والے ہیں اور انکار کرنے والوں (منکروں) کے خاندان کو آتش کرنے والے۔

باشرع و کتاب نور ساطع — با تیغ و زبان دلیل قاطع

آپ کی ذات اپنی شریعت اور کتاب کے ساتھ نور ساطع ہے۔ اور تیغ و زبان کے ساتھ دلیل قاطع۔ کہ کفر و الحاد اور فسق و فجور نہ آپ کی زبان کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے نہ آپ کی تلوار کے مقابلے میں۔

خاکی و باد چرخ فرش منزل — امی و کتاب خانہ دل

جسمانی اعتبار سے آپ خاکی ہیں مگر روحانی اعتبار سے آپ عرش ہے۔ البتہ آپ امی ہیں یعنی کسی کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا۔ مدرسہ علم و معارف کا کارخانہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

نطقش کہ مثال فتح یافت — صد رخنہ جوامع کلم یافت

حضور کے نطق مبارک کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فاستقم کما امرت

وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ کا حکم خدا تعالیٰ نے دیا۔ اور آپ نے اس پر پورا پورا عمل کیا تو اس کا سبب یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن الفاظ کو جو حضورؐ نے دوسرے کے علاوہ خود فرمائے "جوامع الکلم" ہونے کی طرف میں کیا۔ جوامع الکلم ایسے جامع کلمات جن میں بطون و معانی جامع ہوں۔ کم الفاظ اور کثیر معانی۔

پوری آیۂ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"پیغمبرؐ! تم سیدھا راستہ چلو۔ یہ سیدھا کہ جیسا تم کو حکم ہوا ہے۔ اور جس نے آپؐ کے ساتھ توبہ کی۔ اور حد سے نہ بڑھو۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

بعثت تو دمید عالم افروز
وَیش بصد آفتاب شد روز

آپؐ کی بعثت سے جو عالم افروز تھی۔ آپؐ کا دین ایسا روز روشن کی طرح عالم آشکارا ہو گیا کہ گویا سینکڑوں آفتاب سے روشن کیا ہوا دن ہے

بتخانۂ سپہر دہ پائے او — آتشکدہ کشتہ خوئے او
نورے ست بر چشم کوہساں دور — عالم ہمہ سایۂ ازاں نور
رضوان خدائے ہر صحابہؓ — گنجینہ کشائے نہ شرابہ
ہر تارک عرش پائے عرش — ہر سرّ حق اصل و فرعش
گر ظلمت شب ترو کند دور
نزعش برہ خرد نہد نور

جب تک کہ عقل انسانی ریب و شک کی تاریکی سے باہر نہ نکلے گی آپؐ کی شریعت سے نور ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ریب و شک

خود شریعت کے بارے میں)

بر دانشِ ما انجم و افلاک خندند — گر صاحب دل ز شش جہت بیند
صد شکر کہ ما پیروِ آں محبوب رسولیم — در شہرِ دگر ہمسفرانِ ما نیابیم

مولانا غلام امام شہیدؒ

آں مرحمتِ حق کہ پئے رحمتِ عام — قدر از سلفِ اندر و فاقِ رحیما
صیقل گر ایام کہ از صفوتِ رائش — ز آئینۂ امروز نمایند گرِ فردا

ابرِ نورِ محمدی ست دریاب — روشن گہرِ جہانِ آفرینش
نیسانِ کرم، محیطِ احسان — ہر فیضِ جہانِ آفرینش
مہ گاہ ز نامِ فقرِ فخری — سلطانِ زمانِ آفرینش

اے جوہرِ جہانِ آفرینش — سرمایۂ کانِ آفرینش
آں آیۂ رحمتی کہ نازل — گردید بشانِ آفرینش
فتنی و براہِ تست حیران — چشمِ نگرانِ آفرینش
اے جانِ جہاں رسیدہ بر لب — از بحرِ تو جانِ آفرینش
برخیز کہ فتنہ گشت بیدار — از خوابِ گرانِ آفرینش

اے از نیسانِ کرم دے بحرِ احسانِ اتم — دستت بدامانِ ہر لولوئے لالہ ریختہ
فیضِ تو کرد از زمانے با کعبہ آبادانئے — آبادیش ویرانئے ہر لالہ خرمی ریختہ
لطفِ تو از آبِ بقا پر کردہ جامِ اتقیا — چشمِ تو طوفانِ بلا ہر گبر و ترسا ریختہ

رویش زبسکہ آئینۂ حق نما بود — وصل خدائے پاک وصالِ محمدؐ است

باغِ کونین تازگی دارد — از بہارِ تو یا رسول اللہ
مصحف و اہلِ بیت را دانیم — یادگارِ تو یا رسول اللہ
زینتِ چار یارِ تو بینند — چار یارِ تو یا رسول اللہ
شانِ شاہی دہد نشانِ عیاں — از شعارِ تو یا رسول اللہ

محسن کاکوروی:-

پیشوائے رُسُل و سیدِ نسلِ آدم — جلوۂ حضرتِ حق نورِ مجسم ہمہ تن
جس کی تشریف میں خود خامۂ نقاشِ ازل — لکھ چکا مطلعِ ایجاد بوجہ احسن
جس کی بے شربتِ تسلیم نابع ادیانِ و ملل — ثابتِ حق یقیں کاشفِ ہر شبہ و ظن

کیسی تصویر جسے کھینچ کے نقاشِ ازل — خود لگا کہنے کہ ہر وصف میں ہے تو اوّل
تیری صورت سے کھلے معنیٔ مافی الدل — انبیا شرحِ مفصل ہیں تو متنِ مجمل

تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبی
تو ہے شمسیہ تصور میں تو سب ہیں قطبی

بولے جبریل کہ تجھ پر ہوئی ختمِ تکمیل — آدمؑ و نوحؑ کے بخشے تجھے اوصافِ جمیل
خضر و الیاسؑ کا رتبہ شرفِ اسمٰعیلؑ — اور سوا اس کے ہیں اے سرورِ باغِ خلیل

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سر بہ بالا ہے فخر اس کو وجیہ توکل سے
کھنچی ہے رنگتِ یزداں کی گویا شکل مستقبل

حریم ناز میں تکیہ خدا ہے اس کی مسند کا
تعالی اللہ رنگِ خارِ حق اس نورِ مجرد کا

افضلیت پہ تری مشتمل آثار و کتب
اوّلیت پہ تری متفق ادیان و ملل

لطف سے تیرے ہوئی شوکتِ ایماں محکم
قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل

جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم
جس جگہ پاؤں رکھے سجدہ کریں اسود و بہل

عقبِ امّی و شقِ روح محفوظ اس کے سینے میں
پھر اعلم اوّلین و آخرین بیدار ہیں ان

فصاحت ہمہ پستی تھی لب ہائے جنس حضرت کا
زبان شستہ گویا نسخہ تھا اعجاز قرآں کا

قدسی

ماہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد می گذرد تشنہ لبی

بر در شیخ دستادہ بصد عجز و نیاز
رومی و طوسی و ہندی حلبی و عربی

سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ پیش تو قدسی پئے درماں طلبی

یہ قدسی سے لے کر متاخرین تک یعنی اقبالؔ سے پہلے شعراء کے نعتیہ کلام کا نمونہ ہے۔ اقبالؔ کے زمانے اور مابعد اقبالؔ شعراء سے ہمارے مضمون کا تعلق نہیں ہے۔ اور سارے بعد کے قبول ملک الشعراء بہار یہ زمانہ "عہدِ اقبالؔ" ہے۔ یعنی اس زمانہ کا کوئی شاعر اقبالؔ کے اثر سے آزاد نہیں رہ سکا ہے۔

یہ نمونۂ کلام کسی قدر تلاش و جستجو سے اُن شعراء کے کلیات

اور نعت گوئی کی ورق گردانی سے حاصل ہوا ہے۔ اور نعت کے یہ وہ مضامین ہیں جو دوسرے شعرا کے محدود طریقۂ بیان سے کسی قدر ممتاز ہیں۔ ہم کو یہاں تعلق نعتیہ کلام سے بحث نہیں ہے۔ ورنہ اس اعتبار سے ہر دور کے نعت گو شعرا اور ہر صنفانِ رسولؐ کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں۔ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی حضورؐ کی جناب میں نہایت خلوص و محبت کے ساتھ نذرانۂ عقیدت و نیاز کی پیش کش، حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف، حضورؐ کے معجزات کا بیان، معراجِ نبویؐ، اپنے گنہگار ہونے اور حضورؐ کی شفاعت سے متعلق مضامین اور حضورؐ کی اس تعریف میں جو بادشاہوں کی تعریف سے انداز میں کی گئی ہے، ایسے بے پناہ، نادر اور لطیف اشعار ملتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ

حریفانِ بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

اور پھر خاقانیؒ، نظامیؒ، سعدیؒ، جامیؒ، خسروؒ، اور غلام امام شہیدؒ کا فارسی میں اور شہیدیؒ، محسن کاکوروی اور امیر مینائی مرحوم کا اردو شعرا میں کیا جواب ہو سکتا ہے! جامیؒ کے تو ایک ہی شعر کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے اقبالؔ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ؎

کشتۂ انداز ملا جامی ام — نظم و نثر او علاجِ خامی ام
شعر او بر جرمِ معانی گفتہ است — در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ است
آں سخن کونین را دیباچہ اوست
مردِ عالم بندگانِ خواجہ اوست

اور ایسے اشعار ایک دو نہیں اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصار بھی مشکل ہے اور اس کے باوجود بھی یہ حضرات نہایت شاعرانہ کمال کا اعتراف عجز و تقصیر ہی کرتے رہے ہیں۔ آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے خواجۂ دو جہاںؐ کی مدح و ثنا کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہم ایسے اشعار میں سے کبھی اپنے مذاق کے مطابق بعض منتخب شعر نقل کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین کرام اس شراب تند و تیز کے بعض قطرے گھونٹ پی لیں۔

شیخ حکیم سنائیؒ:۔

بر نہادہ خدائے در معراج — بر سر ذاتش از لعل تاج

نعت آں سرورِ فصحا آمد — صفت زلف اذا تجلّٰی آمد
جلّ شأنہ الرفیق الاعلیٰ جوئے — عزتش لا فی البعد ہو سوئے

شیخ فریدالدین عطارؒ:۔

ہر دو گیتی گرد خالِ پائے تست — در یکے حلقۂ بہ جائے تست
بیکساں را کس، تو بی در پیش — من ندارم درد و عالم جز تو کس
یک نظر سوئے من بیچارہ کن — چارۂ کارِ من غم خوارہ کن
گرچہ منالیخ کردہ ام عمر از گناہ — توبہ کردم عذر من از تو بخواہ
اے شفاعت خواہ مشتے تیرہ روز — لطف کن شمع شفاعت بر فروز
دیدۂ جاں را بقائے تو بس ست — ہر دو عالم را رضائے تو بس ست

دمادم، در دلِ من مہرِ تست　　نورِ جانم آفتابِ چہرِ تست

مولانا نظامی گنجوی رح:-

احمدِ مرسل کہ خردِ خاکِ اوست　　ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
اے ترا تو پاک تر از جانِ پاک　　روحِ تو پروردۂ روحِ فداک

اے مدنی برقع و مکی نقاب　　سایہ نشیں چند بود آفتاب
منتظراں را بلب آمد نفس　　اے ز تو فریاد بفریاد رس!

اے نفست نطقِ زباں بستگاں
مرہمِ سودائے جگر خستگاں

محمدؐ کافرینش ہست خاکش　　ہزاراں آفریں بر جانِ پاکش
چراغ افروزِ چشمِ اہلِ بینش　　طرازِ کارگاہِ آفرینش

حضرت امیر خسرو دہلوی رح:-

غمزۂ ما از خمِ ابروئے تست　　طرۂ ما از شکنِ موئے تست
ہر کہ طرازِ تو بیازد نہاد　　نقدِ دو عالم بترازو نہاد
منکہ بجاں تشنۂ روئے توام　　خسروِ ما مسکِ کوئے توام

عرفی شیرازی رح :-

اقدیر بیک ناقه نشاید و نشست — سلمات مدت تو بسی ناقه سر
تا نام ترا فهرست نگردند — شیرازه نجومند بهنگام

از سینه بروں کنم صفا را — گر سنگ جمال تو نگیرد
سرمایهٔ نعمت مصطفیٰ — گنجے بکف آورم گر شاید

خاقانی شروانی رح :-

[illegible] — [illegible]
اشک گرد بیں ستانه [illegible] — [illegible]

پیروزهٔ چرخ اللی خورشید — طرف کمر تراست جاوید
از روز ولادت تو برخاست — تاریخ شرف که آسمان راست

جامی رح :-

گوهر ذرهٔ صدف مکنت — حرز شرف کائنات
سلسلهٔ جنبان دولت رحمت — خنجر قرب ز محیط قدم
آنکه نبیاء در ورا گوید — حمد بر شبیه دست درین بارگاه

ابر رحمت شمع نبوت فروزان — آب ندیرت گل آدم بنوزان
رفعت و منبر افلاک را — رونق از خطبهٔ اولاک را
خطبهٔ آن شان رسالت مآب — پرتو زد خیمهٔ ترکیب آفتاب
خندهٔ از جان جهان در دمید — منصب جبهه بر سر دار سپید
نور جبین ناصیهٔ پاک او — جبهٔ تیس حلقهٔ فتراک او

طرهٔ او نافهٔ دولت گشای
غرهٔ او نور سعادت فزای

ای سراپردهٔ مغرب بخواب — خیز که شد شرق و مغرب خراب
رفت ز دستیم به دل کن نگر — دستی و بنما سپکی دستبرد
ظلمت بدعت همه عالم گرفت — بلکه جهان جامهٔ ماتم گرفت
کاش فتد زاون روحت رجوع — باز کند در رحمت ت دوع
دیدهٔ خاص تو روشن شود — ظلمت گیتی بتو گلشن شود

جامی از آن جا که هوادار تست
روت تو نادیده گرفتار تست

ای ز نسبت دانی لقب — خندهٔ تو همه عجم و هم عرب
گر دسرت لطفی و بیژن بل — خاک دیرت شرقی و غربی
تیغ حرب ار کف ساحت آیت — صیقل جمله [illegible]
از تو سیه راست سپاهی سیاه — به که سیاهی [illegible]

طوطی طبعم که شنا خوان تست
در هوس یک شکر افشان تست

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحم یا نبی اللہ ترحم
ز خاکِ لالۂ سیراب برخیز — چو نرگس خواب چندی از خواب برخیز!
برون آور سر از بردِ یمانی — کہ روئے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہ ما را روز گرداں — ز رویت روزِ ما فیروز گرداں
ادیمِ طائفی نعلینِ پا کن — شراکِ از رشتۂ جانہائے ما کن
جہانے دیدہ کردہ فرشِ راہند — چو فرشِ اقبالِ با بوسِ تو خوشبند
ز حجرہ پائے در صحنِ حرم نہ — بفرقِ خاکِ رہ بوساں قدم نہ
تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہے — کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہے
بخود درماندہ ایم از نفسِ خود رائے — ببیں درماندۂ چندیں بہ بخشائے
اگر بنود چو لطفِ دستیارے — ز دستِ ما نیاید ہیچ کارے
چو ہمچو روزِ رستاخیز خیزد — ز آتش آبروئے ما نریزد

جامی کہ زتندِ بادِ عصیاں — شد خرمنِ طاعتش بتاراج
اکنوں رہِ معذرت گرفتہ — مسکیں بہ شفاعتِ تو محتاج

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ — دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ
خوشا مسجد و منبر و خانقاہے — کہ در وے حدیث و قالِ محمدؐ
بود در جہاں ہر کسے را خیالے — مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ
بصدق و صفا گشت بیچارہ جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

معراج :-

شبے چو باجۂ صبح سعادت — ز دولت ہائے روز افزوں زیادت
سوادِ طرّہ اش خجلت دہِ حور — بیاضِ غرّہ اش نورٌ علیٰ نور
نسیمش جعدِ سنبل شانہ کردہ — ہوایش اشکِ شبنم دانہ کردہ
دہانِ بر چوں سحر خنداں از آں لب — کریزاں روزِ محنت زد شبا شب
درِ شب آں حریفِ اہلِ بینش — سزائے آفریں از آفرینش
چو دولت شد ز ہر خواہاں نہانی — سوئے دولت سرائے امتہانی
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب — ندیدہ چشم بخت ایں خواب در خواب
درآمد ناگہاں ناموسِ اکبر — سبک رو تر ازیں طاؤس اخضر
برد مالید پر کلکے خواجہ برخیز — کہ امشب خواجت آمد دولت انگیز
بروں بر یک زماں زیں خوابگہ رخت — تو بختِ عالمی بیدار بہ بخت
زماں دولت سرا چوں خواجۂ دیں — خراماں شد بہ عزمِ خانۂ زریں
شد از صبحِ جہاں گردوں صدا دہ — کہ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ

سجدۂ اقصےٰ میں تمام انبیائے ماسبق کی امامت کرنے اور آسمانوں سے گزرنے کے بعد لامکاں میں داخل ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں ؎

مکانے یافت خالی از مکاں نیز — کہ تن محرم نبود آنجاں و جاں نیز
قدم بر رنگِ حدثش از جہاں داشت — وجوب آلائشِ امکاں نداشت
یکے ماندہ بہ از قیدِ یکی پاک — ز بسیاری بروں و زاندکی پاک
بدیدہ آنچہ از دیدن بروں بود — مپرس از ما کہ کیفیت کہ چوں بود

نہ چندی گنجد آنجا و نہ چونی فرو بند از یکی لب وز فزونی
شنید انگہ کلامے نے بآواز
معانی در معانی راز باراز

جامیؒ :-

یا صاحب الجمال و یا سید البشر من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قدسیؒ :-

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
چشم رحمت بگشا سوئے من اندازِ نظر اے قریشی بقی ہاشمی و مطلبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آبِ حیات رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی
شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی
ذاتِ پاکِ تو کہ در ملکِ عرب کرد ظہور زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی
نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم زانکہ نسبت بہ سگے کردے تو شدے ادبی
عاصیانیم ز ما نیکیٔ اعمال مپرس سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی
بر درِ فیضِ تو استادہ بصد عجز و نیاز رومی و طوسی و ہندی و حلبی و عربی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی آمدہ پیشِ تو قدسی پئے درماں طلبی

غنی کاشمیری :-

اے جامۂ فقر زیب پیرایۂ تو — درویش و غنی ترا نگر از مایۂ تو
از خامۂ صنع سر نزد نقش دو کون — تا حرف نہ شد سیاہی سایۂ تو

ناصر علی سرہندی :-

پیش از ہمہ شاہان عنیور آمدۂ — ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدۂ
اے ختم رسل! قرب تو معلوم شد — دیر آمدۂ ز راہ دور آمدۂ

فیضی :-

آں مرکز دور ہفت جدول — گرداب نشین موج اول
چابک قدم بساط اخلاک — داں گہر محیط لولاک!
از رایت کبریا موید — سر لشکر انبیا محمد
ہم مطلع اول سبائی — ہم مصرع آخر رہائی
اسرار ازل خزینۂ او — محراب ابد مدینۂ او
زاں خوئے کہ بہ گل فشاند دستاں — ہر قطرہ بہار صد گلستاں
صد باغ بہشت شد نسیمش — صد اطلس چرخ در گلیمش
ناموس سحر بہ عنبریں مو — نقاش چمن بباد گیسو
گیسو دو سوئے بر شکستہ — کونین بتار موئے بستہ
صد نسیم بہار در جبینش — صد دست چمن در آستینش
یک عقدہ عمامہ بر کشادہ — صد طبلۂ صبح سر کشادہ

در یوسف بهشت احرار [illegible] — مصریغ و تر [illegible] مالف [illegible]

نور [illegible] چشم [illegible] — خام [illegible] [illegible] نور

پاک نور دو کون روشنائی — یک گوهر [illegible] روانی

رضوان [illegible] — [illegible] نه [illegible]

مانند [illegible] — [illegible] و [illegible] اسلام

نظیر نیشاپوری :-

صدا از [illegible] [illegible] است آن [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] است با [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] را با [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

غلام امام شہیدؒ

شب میلاد سلطان است امشب
زمین بر خویش نازاں است امشب

ز نور مصطفیٰ ہر جا کہ بینی
تجلی گاہ پیرداں است امشب

سرائے اوکہ ز نور است معمور
نوا گوش فرش سماں است امشب

لب حوراں ترنم ریز تسبیح
بگرد دل زہرہ رقصاں است امشب

ملائک تہنیت گویاں کہ لاریب
شب قدر عزیزاں است امشب

بہر گوشے کہ بینم بہ عالم
بہار باغ رضواں است امشب

شہید بینوا اے بیچو بلبل
دریں گلشن غزل خواں است امشب

امیر مینائی لکھنوی

امت کو شق سرور عالی صفات کا
طوفان حشر ہے مے خضیہ جات کا

یاد جب مجھ کو مدینہ کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

بہ مشت خاک مدینہ کے گرد پھرتا ہے
کروں نثار جو قسمت سے بگولوں کی

زمانے بھر میں ہے اصحابِ پاک کی خوشبو
مہک گیا چمنِ دہر چار پھولوں سے

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

تولا ہے بہت جانچ کے ارباب نظر نے
ہیں شمس و قمر سنگِ ترازوئے محمدؐ

خالی ہاتھ آئیگی روضہ پہ نہ حضرت کبھار
پھول فردوس کے چن لائے گی دامن بھر کر

خدا کریم، محمدؐ شفیعِ روزِ جزا
امید کیا ہے حقیقت مرے گناہوں کی

محسن کاکوروی :-

مولا کی نوازش نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیشِ قدسیاں کھلتی ہے
کہہ دو کہ ملک گوش بر آواز ہیں
مدّاحِ محمدؐ کی زباں کھلتی ہے

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی
زیبِ دامانِ ابد طرّہ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مقابل نہ مماثل نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول

مہرِ توحید کی ضو اوجِ شرف کا مہِ نو
شمعِ ایجاد کی لَو بزمِ رسالت کا کنول

مرجعِ رتبۂ امیں زیبِ دہِ عرشِ بریں
حامیٔ دینِ متیں ناسخِ ادیان و مِلل

ہفت اقلیم ولایت میں شہِ عالی جاہ
چار اطراف ہدایت میں نبی مرسل

دورِ خورشید کی کبھی تم میں ہو جائیگی صبح
تا ابد دورِ محمدؐ کا رہے روز افزوں

شبِ اسریٰ میں تجلّی سے رُخِ انور کی
پڑ گئی گردنِ رفرف میں سنہری ہیکل

لطف سے تیرے ہوئی شوکتِ ایماں محکم
قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل

بحرِ امکاں میں رسولِ عربی دُرِّ یتیم
رحمتِ خاصِ خداوندِ تعالیٰ بادل

قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضورؐ
موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے گویا بادل

دینِ اسلام تری تیغِ دو دم سے چمکا
یا اُٹھا قبلہ سے دیتا ہوا کاندھا بادل

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ؒ

اُن کی مہکے نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں

اُن کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہوگا!
رو رو کے مصطفےٰؐ نے دریا بہا دیئے ہیں

لحد میں عشقِ رُخِ شہ کا داغ لیکے چلے
اندھیری رات سُنی تھی چراغ لیکے چلے

وہ ماہِ حُسنِ حضورؐ ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دُور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

چند اشعار سلام کے بھی ملاحظہ کیجئے۔

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

شہریارِ ارم تاجدارِ حرم
نوبہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

فتح بابِ نبوّت پہ بے حد درود
ختمِ دورِ رسالت پہ لاکھوں سلام

کنزِ بے کس و بے نوا پر درود
حرزِ ہر رفتہ طاقت پہ لاکھوں سلام

وہ کرم کی گھٹا گیسوئے مشک سا
ابرِ رافت پہ لاکھوں سلام

چشمۂ مہر ہیں موجِ نورِ جلال
اُس رگِ ہاشمیت پہ لاکھوں سلام

جس کے ہیں نقشِ شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس کو بارِ دو عالم کی پروا نہیں
ایسے بازو کی قوّت پہ لاکھوں سلام

کعبۂ دینِ ایماں کے دونوں ستوں
ساعدینِ رسالت پہ لاکھوں سلام

جس کے ہر خط میں ہے موجِ نورِ کرم
اُس کفِ بحرِ ہمّت پہ لاکھوں سلام

خندۂ صبحِ عشرت سو سو درود
گریۂ ابرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

پارہ ہائے صحف، غنچہ ہائے قدس
اہلِ بیتِ نبوّت پہ لاکھوں سلام

آبِ طہمہ سے جس میں پودے جمے
اُس ریاضِ نجابت پہ لاکھوں سلام

زہ بتولِ جگر پارۂ مصطفےٰ
حجلہ آرائے عفّت پہ لاکھوں سلام

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اُس ردائے نزاہت پہ لاکھوں سلام

سیّدہ زاہرہ، طیّبہ، طاہرہ
جانِ احمدؐ کی راحت پہ لاکھوں سلام

ابنِ اسلام کی مادرانِ شفیق
بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام

حاملانِ یدِ واحدہ پر درود
حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

کاش! محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُنکی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قابل کہیں ہاں رضا
مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مولانا حسن رضا خاں حسنؔ بریلوی

مٹی نہ ہو برباد پس مرگِ الٰہی
جب خاک اُڑے میری مدینہ کی ہوا ہو

دے ڈالئے اپنے لبِ جاں بخش کا صدقہ
اے چارۂ دل دردِ حسنؔ کی بھی دوا ہو

گُلِ خلد کے بدلے زاہد تمہیں خارِ طیبہ دیدوں
مرے پھول مجھ کو دیجئے بڑے ہوشیار آئے!

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کے چمکتے خورشید!
لامکاں تک ہیں اُجالے تری زیبائی کے

باغِ جنت میں مرا ہی چمن آرائی ہے
کیا مدینہ پہ فدا جو کے بہار آئی ہے

اُن کے گیسو ہیں جنت کی گھٹا چھائی ہے
اُن کے ابرو نہیں دو قبلوں کی بھائی ہے

باغِ فردوس کھلا، فرش بچھا، عرش سجا
اک ترے قدم لی یہ سب چمن آرائی ہے

جسے بے خواب کے صدقے میں ہیں بیدار نصیب
آپ جاگے تو ہمیں چین کی نیند آئی ہے

نثار عظیم آبادی

اے اوّل رہیں اس آمد پہ میں نثار
اُس کبریا کی وہ دولت سرمد ہیں نثار

الطاف و فیض و رحمتِ بیحد پہ میں نثار　　دی رحمتِ بہشت محمد پہ میں نثار
دوزخ کا اب نہ خوف نہ دھڑکے عذاب کے
توحید خود بتائے رستہ ثواب کے

جاتے ہیں سوئے عرش بریں خاتمِ رسلؐ　　لٹتے ہیں راستے میں ستارے کے آج گل
حاضر ہیں انبیائے سلف آستاں پہ گل　　ہے قدسیوں میں صلّی علیٰ مصطفیٰؐ کا غل
مہتاب رُخ سوئے درِ دولت کھڑے ہوئے
استادہ کس ادب سے ہے مشعل لیے ہوئے

کرامت علی خاں شہیدیؒ :-

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا　　ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمدؐ کا
اُدھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل　　خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں　　قفس جب وقت لوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا
خدا اللہ چوم لیتا ہے شہیدیؒ کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

لطف بدایونی :-

رُخِ مصطفیٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری چشمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

سراپا کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ سراپا لکھنے کی ہر نعت گو نے کوشش کی ہے مگر محسن کاکوروی کا سراپا، اُردو زبان کی شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے بھی عالمگیر ہے۔ مقبولیت کا یہ حال کہ کہتے ہیں، کہ کوئی شخص عشاء کی نماز کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھے تو ایک ہفتہ کے اندر حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہو کر رہے۔ چنانچہ سراپا اس مقصد کے لئے خاص طور پر پڑھا جاتا ہے۔

تمہید کے اشعار کو چھوڑتے ہوئے سراپا کے اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی بعض اشعار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جسم محبوبِ خدا النور کا ایک پتلا ہے — سایۂ حق وہ شہِ منزلت طاہا ہے
اس کے قامت کو بھلا سایہ مناسب کیا ہے — سچ ہے محبوب جو لاثانی ہے وہ یکتا ہے

لاکھ عاشق ہوں مگر لطف دو محبوب نہیں
ظلِ حق ہو تو ہو پر ظلِ نبیؐ خوب نہیں

قدر کے اوصاف رکھو یاد نہ بھولو بخدا — سجدۂ سہو نہیں ایسی عبادت ہے روا
آبِ آئینۂ باطن سے وضو کر کذرا — اِنّی وجّہت کر و نیتِ صادق سے ادا

اُٹھ کھڑے ہو پئے تعظیم دمِ طاعت ہے
یہی تکبیر میں عشاق کی قد قامت ہے

سرِ اقدس ہے حبابِ لبِ دریائے قدم — دُرّۃُ التاج ہے اس بحر کا یہ قطرۂ نم
میمِ احمد کا ہے دامانِ اُحد سے منضم — یوں حدوث اور قدم کے ہیں یہاں باہم

قطرہ بحریست کہ از بحر جدا نم ہمہ
بحر و بر قطرہ بخندید کہ ما ہم ہمہ

لے اُمت کے گنہ آپ نے اپنے سر پر — بخشش حق ہو نہ ہم پر متوجہ ہو نگر
دن گنے جاتے ہیں کب روز شمار آئے نظر — زلفِ مسکیں کو دکھا کر کہیں پیغمبرؐ

ہاں چلو محشر کے بازار سے سودا دیکھو
نقدِ سرمایۂ اُمت کا سیاہ کار دیکھو

سایہ ہے فرق بنایوں پہ جناب حق کا
پرِ رو بال فرشتہ پر نہیں کھولے ہے ہما

عالمِ غیب کا مردار ہوا جیوہ مثنا
نہیں سر پہ رہا سلطانِ عجم کی وہ شا

کشورِ کامل پہ پرچم و علم سر ہو رہے
نہ ختن ہے نہ خطا ہے نہ یہ عنبر ہے

خوشنویسِ ازلی کا ہے وہ پُر زور قلم
ہر حرف صرف ہے اس کا سرِ تختہ

اہلِ ایماں کے لیے مژدۂ سرشاہ ہم
خطِ کفر میں ہے سرِ خطِ کفر زار ہم

کوچۂ خلد نظر آنے لگا سب میں
خوب مرد و سیہ لکھا ہے جو طغرا میں

رُخِ پُر نور ہے کافر سبگوں سے ظاہر
دیکھ لو دامنِ موسیٰؑ کے تھے شعلۂ طور

سُنبلے میں ہے عیاں جلوۂ ماہِ پُر نور
اس رحمت میں ہے خورشیدِ قیامت مستور

شبِ معراج میں ہے شمعِ تجلی روشن
لیلۃ القدر میں ہے نورِ الٰہی روشن

وصفِ پیشانیٔ یدی ہوتا ہے قلم سرزد
لوحِ بسم اللہ ابر جیسے کھلے ہے لیکن

مصحفِ کل ہے رُخِ فاتحۂ نسخۂ دیں
سورۂ فاتحہ مصحفِ کل ہے وہ نہیں

گلشنِ عالمِ تنزیہ رُخِ زیبا ہے
گلستانِ مقدس کا یہ دیباچہ ہے

ہیں زوالِ ابروئے سیہ زیبِ جبیں انور
طاق یا خانۂ خورشید کے آتے ہیں نظر

نقشۂ ابرو دکھائے جو عدو رد لکھ کر
مہ نو تیغ سے مریخ کی ہو دو پیکر

خواب میں بھی جو وہ زہرہ سی جبیں آئے
مشتری طالعِ کنعاں کی زحل ہو جائے

دیکھ تو ہم کہلوئے پیشانی امروز ابرو — ہیں اسی آئینہ حسن کے جوہر ابرو
گردنے دہ خنجر ہیں تقدیر ابرو — موج دریائے شجاعت ہیں مرا ابرو
میرا دل ہیں میں سوز کی یہ تصویر ہیں ہیں
یہ کمانیں جو کہ بدر میں شمشیر ہیں ہیں

اب رگ گل ہے ہمیں تیرا ابروئے سیاہ — کرنا آتی ہے وقت غضب تعابنشاہ
حرفہ تعبیر ہے تیغ سے فتح الاں کی نگاہ — الف قم تیغ سے ہوئے ہے بسم اللہ
لفظ و معنی میں عجب ابرو خرد کے طاق ہے
عف طاق چپ یا تو مدد خاق ہوئے

رگ جو کاٹے ہے تو شاہین ترا ابرو — مرد کے سنگ ہے اور پنجہ ہے چشم و لجو
ہنکہ پڑ جائے اگر جانب امت سر ہو — ساتھ رکھتی رہے میزان قیامت یکسو
سب یہ ہے ہمارے ہوں تو کیا کھٹکا ہے
مردمک چشم کہیں تم نے اسے تولا ہے

حرفہ مضمون ہے تجھے پیش نظر ہو آگاہ — منظر چشم نبی پر بھی ذرا کیجیے نگاہ
ایسی نرگس کہیں ہے نہ بادام سیاہ — چشم بد دور عجب آنکھ ہے ماشا اللہ
ماہ اگر اچھی سے اچھی کوئی تشبیہ کہے
چشمکیں مارے سخن گوئے نظر فیہ کہے

اک نیا نسخہ نکالوں دل پر جوہر سے — صفحہ پر سیم کے لکھیں جسے آب زر سے
پلکیں اکسیر کی بوتی ہیں سنا اکثر سے — بوئے چشم یہ ہے آئے ریح الزہر سے
صدقے اے دولت بیدار ترے سونے کے
ڈھیلے آنکھوں کے نہیں ڈھیلے ہیں یہ سونے کے

گوش پر نور ترا زلف شب آسا مستور — کہیں دھوکے سے بھی دیکھے تو سحر ہو کافور
رنگ کا اس کے صبا سن کے چمن پر نیلو — کہے گل سے کہ ہوا ہو نہ کھڑا میرے حضور

گوہرِ یوسف سے گرداگردِ دریا پُر ہو
یوں صدف سے کہے موتی اس میں جیسے دُرِ ہو

سرخیٔ کوہِ قطب گرچہ یہ تشبیہ ہے تیز
بیخ کیا ہے اشارہ کہ کرن مہر سے گرتی ہے

بے زمیں کیجئے ہر ذرّہ کی مردم خیز
ٹُک نے میدان میں ہر اک ذرّہ شمس تبریز

گوشِ دیوار میں دیکھ کے سب کہتے ہیں
قطب و صاحب غوث یہیں رہتے ہیں

ہیں قدس شاہنشہ ساری منظر
آب آئینۂ یوسف ہی حق نور

خوبروئی ہے بلا ہے یہ جمیل اختر
یوسف حسن کا معراج ہے یہ چشم نظر

ملتجی خدمت ہے یہ صف جبیں ہے
دیکھنا حارث نور کا حرا میں ہے

صورت چشمہ نور ہے سب ماں پر نور
کس بلا کا وہ جبیں ہے سب نور پر

شاخ نخل گل کی ہے روئے جناب اطہر
نور کی شاخ کی غیبی مبارک تیل مُر

دل عارف اسی کے سایہ میں دم لیتا ہے
نور یہاں سے سوئے قدس لیتا ہے

چشمۂ مہر سے اس جبریں ب رونق ہے
تختۂ ملک ملکوت تسلیم سے رونق ہے

نرگس رخسار نور ان کا جبہ حق ہے
رنگ رخسار سحر سے منے جبہ حق ہے

مطلع صبح ہے غنی ہے انور فی ہے
سر چشمہ یہ سکر نور ہے لا فی ہے

نور دیکھے جو تیرے تو ملک سلت ہو
شمع کے جی رہے تو کب بیٹھے ہو نہ ہو

ثابت ہو سے تو در شیر تو یہ سوز ہو
صبح ہو جائے تو حسن پہ کا پیشور ہو

حسن یہ سر تو نہ ہے مقابل میں
چرخ پہ سورۂ یوسف کو ملتے ہیں

روبرو جلوۂ خورشید کے سایہ کیا ہے! — سامنے شمع منوّر کے اندھیرا کیا ہے!
عاقلو غور سے دیکھو کہ یہ نکتا کیا ہے — اُمّی ہونے میں بھلا آپ کے شبہ کیا ہے

کوئی تدبیر تو بڑھنے کی بجا ہی نہ رہی
نورِ رخسار سے حرفوں میں سیاہی نہ رہی

لبِ جاں بخش کی تشبیہ دمِ عیسیٰؑ سے — دی نہ دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آبِ حیواں نہ کہا، خضر نے گو پھینٹے دیئے — اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے

کہوں یاقوت تو وہ باتیں لیاں بانی نہیں
لعل سمجھوں اُسے آنکھیں میری پتھرائی نہیں

ذکرِ وصفِ دُرِ دنداں میں کیا سارا دن — رات بھر تارے ہی گنتے رہے بیٹھے ملا حسن
جس کی تشبیہ نہ ہو اُس کی صفت کیا ممکن — یوں تو ثابت ہے کہ سیارے بھی ہیں روشن لیکن

غور سے دیکھئے تو صبح کے یہ چھالے ہیں
یا لبِ ساغرِ افلاک کے تنجالے ہیں

اے سخن داں کہئے اسرارِ دہن کس نے بیاں — مل گیا خاک میں جو چشمۂ آبِ حیواں
پہنچے ہیں حقۂ گوہر کے جگر تک دنداں — دُرج یاقوت میں ہے آتشِ حسرت کا دھواں

رنگ غنچہ کا اُڑا گل کی تعلّی چھوٹی
مُنہ پہ پستہ کے ہوائی یہ ہوائی چھوٹی

کوئی کہتا ہے کہ اس کو شکرستان کہئے — کوئی کہتا ہے ملاحت کا نمکدان کہئے
خضر بولے کہ اُسے چشمۂ حیواں کہئے — اور سلیماںؑ نے کہا خاتمِ یزداں کہئے

ہر جگہ مشتہر اس کا لقب تازہ کیا
حق تعالیٰ نے اسے صاحبِ آوازہ کیا

غنچہ نے پیش کئے گرچہ ہزاروں مضموں — گفتگو اس میں ہوئی بولی مری طبعِ موزوں
ہیں شکافِ قلمِ صنع اُسے کیوں نہ کہوں — جس سے ظاہر ہوا سرِّ خفی کن فیکوں

شعرا نے اُسے کیا جانئے کیا کیا سمجھا
ہم اعظمؔ ہ مگر ہم نے مقدس سمجھا

رئیسِ مرسل کو نبوت کا رسالہ کہیے
نشستِ خدا شکست کی صدا سمجھیے
سرِ زبانِ خدا و خطِ تمنا کہیے
ملک تقدیر کا یا خطِ شکیب کہیے

جس کی بیداری سے ہوئے بخت بیدار
ہے شفاعت کی سند خطِ غضنفر اس کو

ہے جو خوبی ہے قرآں کا پیارا نسخہ
ہاتھ سے جس کے فاضل مصنف نے لکھا
مشکل از بسکہ تھا مضمونِ دہن کا نکتہ
اس لیے حاشیہ لکھا ہے خطِ زیبا نے

رخِ جویں ہے تو اک جزو ہے یہ ایماں کا
ہے یہ حاشیہ یہ مطلبِ قرآں کا

ذکرِ پاک نعت صاف ہے چشمِ زیبا
لا بسوہیں سرِ موئیں کچھ فرق نہ آیا
چہرہ یہ ہے خطِ کنعاں سے یعنی لکھا
کہ وہ ہے سر بخشت دیں و دنیا

جمع خاطر ہو تو کیجیے یہ معنی میں کیجیے
دیکھیں تضمینیں بہت اک نئی تضمیں کیجیے

ہے وہ جو ہے گیسو نے جیب ریزداں
اور محرابِ حرم کا ہے اس پر یہ کمال
اس میں پاکیزہ مشک ہے نگہ دامان
مردمِ چشم ہے بیٹھا ہوا اک ناخدا خوان

زیرِ رخسار مبارک وہ خطِ ریش لطیف
جس پہ ہے جس پہ قرار رکھا ہے قرآنِ شریف

لو کا ہے یہ روشنی شمع والا
شمع کا نوری گردن کا دمکتے نقشہ
جس پہ روشن ہے یہ ہے مہر قمر رسا
پر یہاں جیتے ہیں جبریل کے اندیشہ

سرفرازی ہے اسی گردن کو بہت زیبا ہے
آتشِ حسن کا سوز کا یہ شعلہ ہے

بارک اللہ وہ گردن ہے کہ فوّارۂ نور — جس سے ڈوبی عرقِ شرم میں ہے شمعِ طور
کیسی مینا و صراحی کی یہاں لیا ذکر رہا — بزمِ تنزیہہ کی کیٹھے اسے مینائے طہور
جس کی کیفیت اگر دیدۂ باطن میں سمائے
خلد میں شربتِ دیدارِ حق اچھو ہو جائے

ہاں گردن پہ جھک آئے تو ہوا یہ روشن — کہ شبِ فکر میں افروختہ ہیں شمعِ سخن
ہے تجھے کس لئے اے خامۂ ایجادِ الجھن — انتخابی ہیں سب اشعارِ بیاضِ گردن
ہر شب در روزنِ چہ آشفتہ سری ہر دی
تا کہ سجدہ گیسو بہ بیاضِ آوردی

صفتِ مہرِ نبوّت کا بیاں ہو کیوں کر — خامشی مُہرِ دہن اور سخن ہے مُستدر
مُہر کی پشت کے فقروں سے یہ حق نے لکھ کر — کہ ہوا ناتہ پیغامبری ختم اس پر
ہوئے پھر بھی جو سیہ دل متنبی گمراہ
ختم اللہ علی قلبہم انا اللہ

دستِ رنگیں کی صفت بارِ خدایا کیا ہے — شاخیں حکمیں جو کہ پشت نہ گلِ رعنا ہے
تو طی ناطقہ اس باغ میں چپ رہتا ہے — بلبلِ طبع کو غنچہ کی طرح سکتہ ہے
ہاتھ باندھے ہوئے جبریل کھڑے رہتے ہیں
دستِ رنگیں کو یہاں دستۂ گل کہتے ہیں

ہند و دستِ آپ کا ہے یا کوئی خمسۂ کمند — طبعِ استادانہ ہی ہے عجب مارک مند
انگلی ہر ایک ہے وہ مصرعِ موزوں و بلند — انگلی رہ سکتے نہیں سایہ کہیں دانشمند
تو کو فخرِ صفتِ پنجۂ اقدس بس ہے
اس مسدس کے شرف و یہ خمس بس ہے

تو کف دستِ منور کو میں کہتا ہوں ماہ — نور کیجئے کہ شبیہ ہیں خاطر خواہ
مہرِ انور ہے تجھے یہ مہ و خورشید شاہ — دونوں ہیں صحت مقابل ہوئے اللہ اللہ

ہم نے یہ معجزۂ عقدِ انامل دیکھا
اک گھڑی میں مہِ نو کو مہِ کامل دیکھا

کون لکھے صفِ سینۂ صافِ سرورؐ — دست بر سینۂ زیبا سرت ہے یہاں حق و بشر
اور کہتے ہیں فرشتے بھی حیراں ہو کر — لوحِ محفوظ ہے یا عرشِ خدا پیشِ نظر

صدرِ ایوانِ رسالت کا عجب سینہ ہے
صورتِ علمِ لدنّی کا یہ آئینہ ہے

صاف و بے موئے نبیؐ کا ہے سمیں شفاف — جیسے لفظوں سے حرفِ لک صدرک ہیں صاف
ہاں مگر سینہ سے ہے اک خطِ مشکیں تا ناف — جس کو کہتا ہے مخمور کششِ مرکزِ قاف

صدرِ پُرنور کے متقی ہونے کی مثال ہے یہ
عقل کہتی ہے وہ آئینہ ہے اور بال ہے یہ

مخزنِ گوہرِ اسرارِ شبِ اسریٰ ہے — شرحِ صدرِ شہِ عالی کا یہ اک نکتہ ہے
جو کہ لبریزِ لطافت ہے یہ وہ چشمہ ہے — جس میں امواجِ لطافت ہیں یہ وہ دریا ہے

خط نہیں سینۂ شاہنشہِ بحر و بر کے
غنچہ میں موج ہے یہ بحر میں گویا ہر کے

گرچہ پرواز میں اندیشہ ہے بالِ جبریلؑ — اور آجائے مقامِ بھی ہے فکرِ سرافیلؑ
نہ ملی پر کوئی نازک سی کمر کی تمثیل — ہو گیا ہم عددِ لفظِ عدم لفظِ عدیل

قاف تک ہم نے بہت قافِ کمر ڈھونڈا ہے
کمریں دیکھی ہیں پر ایسی کمر عنقا ہے

ہیچ اس جا ہے کسی تیغ و کمر کا مذکور — اس کے اوصاف میں مشہور میانِ جمہور
تا کمر غرقِ عرق ہو گئے سب اہلِ غرور — سامنے اس کے اوصاف میں مشہور میانِ جمہور

سُن کے اوصاف شجاعانِ جہاں گھبرائیں
جیتے میداں میں جو آئیں تو ہرن ہو جائیں

لا خطِ نسخ میں ناسو تو کہوں اک نکتہ — لام الف کا ہے تقاطع وہ کمر نسبتِ علیٰ
داد کیسا کمروں پہ یہ خطِ نسخ کھینچا — کمرِ یار کو معدوم ہی سمجھے شعرا
نہیں ثابت قدم اس نفی سے استثنا بھی
یہ وہ لا ہے کہ نہیں اس سے بچا الّا بھی

سرعالا ہے فدائے قدمِ پاکِ نبیؐ — وصف میں جس کے سخنداں کا لگا گھٹنے جی
ہاتھ آیا ہے جو کاغذ تو یہ حسرت ہے نئی — نہیں چلتا ہے، لگی پائے قلم میں مہندی
سر بزانوئے ادب آ کے سخن گو بیٹھیں
فکرِ عالی کے فرشتے بھی دوزانو بیٹھیں

دیجئے لیا اُسے شمشاد و صنوبر سے مثال — چمنستانِ ارم اس کے قدم سے ہے نہال
سروِ جنت سے نکل آئیں لئے استقبال — کہے سبزہ کہ مجھے شوق سے کیجئے پامال
مثلِ بلبل کے سرِ راہ بچھائیں گل چشم
فرشِ فردوس گلابی ہو تو ہو بلبل چشم

شور ہے عالمِ بالا پہ قدر رعنا کا — سر افلاک ہے قدیہ قدم والا کا
ساق ہے حلِ تمنا ملاءِ اعلیٰ کا — خاکِ پا غازہ ہے حوروں کے رخِ زیبا کا
رکھ دیا آپؐ نے جس فرش پہ دوبارہ قدم
بڑھ گیا پایہ یہیں وہ عرش سے بھی چار قدم

نرمیں تر کر ہٹے پائے نبیؐ کرسی پائے — شمع گور شک سے جل جائے مگر سر نہ اٹھائے
ناخن پا جو ذرہ عقدہ کشائی پہ آئے — گرہ ابروئے خوباں کی حقیقت کھل جائے
ماہِ نو گر کہیں ہم چشمی کا خمیازہ کرے
ناخنہ چشم فلک میں خلش تازہ کرے

لو مبارک ہو قدم بوسی حضرت محسنؔ — کس کو ہوتی ہے نصیب ایسی سعادت محسنؔ
سب ہیں ماقی بے کچھ خواہشِ ہمت محسنؔ — آرزو اتنی ہے بس روزِ قیامت محسنؔ

سر کے بل جاؤں جو نقشِ قدمِ سرورؐ پر
صاف محشر کی زمیں رکھ لوں تو کر سر پر

ہے یہ امید کہ جب رحم ہو بار اے شور
بول کیجئے بادشہ بار کہ عالم ذرہ

لو سراپا ہیں تم دو موزونِ حور و قصور
میں کہوں زاد تجھے یہ ہیں ہر کہ منظور

مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسفؑ کی یہ تقدیر نہیں

بہرحال ہم نے اقبالؔ سے پہلے کے تمام شعراء کا نعتیہ کلام پیش کر دیا ہے۔ وہ کلام جس میں انتہائی جوشِ محبت اور نہایت درجہ وارفتگیٔ عشق کے عالم میں حضور اکرمؐ کی جناب میں ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے۔ حضورؐ کے معجزات اور خرقِ عادت بیان کئے گئے ہیں۔ معراج کی تعریف میں زورِ طبع، زورِ قلم اور فکر رسا کی بلند پروازی دکھلائی گئی ہے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے حضورؐ کی رحمۃ اللعالمینی کا حوالہ دے کر حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ ہونے اور شفاعت کے بجائے دوزخ میں حضورؐ کی شفاعت کے لئے درخواست کی گئی ہے۔ حضورؐ کا سراپا لکھنے میں شاعری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ اور حضورؐ کے زمین پر تشریف لانے، دنیا کی موجودہ ابتری و بدحالی اور اسلام کی زبوں حالی دیکھنے اور پھر ایک دفعہ دنیا میں امن و خوش حالی اور اسلام کو سربلند کرنے کی گئی ہے۔ اور وہ کلام بھی پیش کر دیا ہے جس میں اندازِ نعت گوئی

دوسری ہمہ گیر صفات کی تعریف کا حامل ہے۔ لیکن اقبالؔ کا رنگ ان سب سے الگ ہے۔ اور یہ بات شعرائے ماسبق کے اس دوسری قسم کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔ اور اگر کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں تو وہ نہایت مدھم اور ناواضح ہیں۔ یعنی حضورؐ کے وہ اوصاف جو آدمؑ سے لے کر آج تک کسی انسان میں جمع نہیں ہوئے۔ اور جو نوعِ انسانی کی ہر شعبۂ حیات میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اور کیسی رہنمائی؟ وعظ و پند ہی کی زبان سے نہیں بلکہ عملی کا نمونہ دکھلا کر۔ ہر قوم کا تصور اور پھر حضورؐ کو امت سے انتہا درجہ کی محبت تھی اس لئے قوم سے ایسی محبت کہ قوم کے مقصد کے پیشِ نظر اپنے ذاتی و انفرادی مقصد کی مطلق پروا نہ کرنا۔ یہ بات بھی کسی کے ہاں اس خوبی کے ساتھ نہیں ملتی۔ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت کیا تھی؟ اور حضورؐ کی تعلیم سے کیا ہو گئی۔ کہاں سے کہاں ہو گئی۔ اور موجودہ عالمگیر فساد اخلاق و آدمیت اور اسلام کی پستی و زبوں حالی کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ غرض کہ سیرتِ پاک کے تمام نہ سہی خاص خاص پہلو بھی سامنے آجاتے۔ معجزات سے تو اسی وقت کے لوگ اور وہ بھی ہی متاثر ہو سکتے تھے جو خود ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف سے چشم و گوش بند کر کے معجزے دیکھنے چاہتے تھے۔ حضورؐ کے وہ محامد و فضائل جو دنیا میں ایسے پاکیزہ انقلاب کا باعث ہوئے۔ جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتی۔ اور جو دنیا کی تاریخ میں آج بھی آفتاب کی طرح درخشاں ہیں۔ اور آج ہی نہیں قیامت تک دنیا ہدایت حاصل کرتی رہیگی۔ اور امن و اطمینانِ خاطر، خوشحالی و اقبال مندی جس کا لازمی نتیجہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان صفات کا بیان کس نے کیا اور حضورؐ کے ان احسانات کو کس نے گنوایا۔ اس لئے کہ نوعِ انسانی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ اقبالؔ نے یہی کام کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کو بھی

سمجھا اور حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ والا کو بھی اور حضورؐ کے ان اوصاف ہی کو زیادہ بیان کیا ہے اور نئے نئے اسلوب اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے جو زندگی کے ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اور جن پر عمل پیرا ہونے سے آج بھی دنیا کا کلیش دور ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ اقبالؔ حضورؐ کے ان اوصاف سے تاثر عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے اس لئے انہوں نے اُس پیکرِ حسن و جمال کی سیرتِ پاک کے ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی رفتار و گفتار کی ایک ایک ادا کی تعریف ایسی وارفتگی اور شیفتگی کے ساتھ کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر ادا پر جان و دل نذر کرنے کو تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک ایک بول دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اُترتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح تمام ماسبق شعراء کے ہاں ملّت کا تصوّر ..... (CONCEPTION OF NATION) بھی قریب قریب ناپید ہے۔ زیادہ تر شعراء نے حضورؐ کی جناب میں اپنا ہی رونا رویا ہے اور اپنی ہی طرف سے ہدیۂ نیاز پیش کیا ہے۔ اور حضورؐ کے لطف و کرم کی درخواست اپنی ہی ذات کے لئے کی ہے قوم کا خیال مطلق نہیں آیا ہے۔ حالانکہ حضورؐ کے عشق کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ جس قوم کو حضور اس قدر چاہتے تھے اُس کو فراموش نہ کیا جاتا۔ اور حضورؐ کی جناب میں اس کی ابتری و زبوں حالی کا رونا رویا جاتا اور اس کے درد کا مداوا طلب کیا جاتا کہ قوم کے ساتھ خود بھی حضورؐ کی توجہ سے فیض یاب ہو جاتے اگر اس سے آگے بڑھے تو جمع کے صیغہ کے ساتھ کچھ شکایتِ زمانہ یا مصائبِ روزگار کا بیان کر دیا ہے۔ کہ ہمارا حال بہت زبوں ہے، زمانہ ہمارا دشمن ہے، حضورؐ کے سوا ہمارا کون ہے جس سے اپنا

حالِ زار کہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھے تو ساری دُنیا کی خرابی و ابتری کو بیان کر دیا ہے کہ حضورؐ دنیا میں گناہوں کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ ظلم و ستم اور دکھ درد کی انتہا ہو چکی ہے اب آپؐ ہی تشریف لائیے اور دُنیا کی حالت کو بدل دیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حالی دنیا ایسا خراب کیوں ہے ــــ یہ مصائب و آلام کا طوفان کیوں آیا ہوا ہے ــــ سکون خاطر اور اطمینانِ دل کیوں ناپید ہو گیا ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں کی ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔

ملّت کا تصوّر اور حضورؐ کی عالم آرا صفات کا بیان سب سے پہلے اُردو شعراء میں حالی نے کیا ہے۔ اور حالی کے بعد اقبالؔ نے اس عرش تک پہنچا دیا۔ مسدّس مدوجزرِ اسلام میں چند ہی بند لکھے ہیں مگر یہی بند تکمیل ریلری تھی اس برگ و بار کی جو اقبالؔ کی طبعِ وقاد اور ذہنِ نقاد سے ظاہر ہوئے۔

حالی فرماتے ہیں ؎

ہوئے محوِ عالم سے آثارِ ظلمت — کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت
نہ تھیٹکی مگر چاندنی ایک مدّت — کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت

یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطاکار سے درگذر کرنے والا — بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
بلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمّی
نہ کچھ قدر تھی، اور نہ قیمت تھی جس کی

طبیعت میں جو اس کے جوہر تھے اصلی
ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی

یہ تھا تبعِ علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر!
تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر

گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق و کاذب؟"

کیا سب نے "ہاں آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"

کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کرو گے اگر میں کہوں کہ"

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ جس سے صادق ہے تو اور امیں ہے

کہا "گر مری بات یہ دلنشیں ہے
تو سُن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلیاں سے ہے جانے والا
ڈراؤں سے خود وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کڑکی تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس سے ساری ہلا دی

نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے اُس گمراہ قوم کو کیا کیا سکھایا، ان کی کون کون سی بُرائیوں کو چھڑایا اور بُرائیوں کے بجائے اُن میں کیا کیا محاسن پیدا کئے۔ غرض کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ریگستانِ عرب دفعتہً ایک سدا بہار باغ بن جاتا ہے۔ مسلمان اقوامِ عالم پر دینی و دنیاوی ترقیات کے اعتبار سے سبقت لے جاتے ہیں۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں دُنیا کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اسی طرح مسدس کے آخر میں عرضِ حال کی ہے۔ تو اس میں اسلام اور مسلمانوں ہی کی حالت پر خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دیں بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کہ مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

جس دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جس دین نے غیروں کے کئے دل کے ملا دئے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس پہ برپا ہے

جس دین کی حجت سے سب اہلِ یماں تھے مغلوب
اب معترضوں اُس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دینداروں میں پر آب ہے، باقی نہ صفا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں نگ و شب و روز
یہ مجلسِ اعیاں ہے وہ بزمِ شرفا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
یہ نام تیری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بفلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے

بیڑا جو نہ تھا بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہے

وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو فضا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج اُن کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ خدا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلا ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے

فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی
دنیا پہ ترا لطف عام رہا ہے

کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

اُمت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تیری عزت کی ادا ہے

ہر چند مخالف ہیں ترا نام
ہتھیار حوالوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تیری اُمت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے کی کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو تو کیا!
اب تک تو ترے نام پہ اک دل فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

گردن کی جو کھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دُنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

آپ نے دیکھ لیا کہ حالی کے تقریباً وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کو ہم نے اقبال کے نقیبہ کلام کی خصوصیات قرار دیا ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے وہ پہلو جو ہماری زندگی کے ہر راستے میں رہنمائی کرتے ہیں، قوم و ملت کا مکمل تصور جو اسلام نے متعین کیا ہے۔ اور قوم کے لئے اپنی ذات کو فراموش کر دینا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ شراب جو حالی نے تیار کی تھی اس کو اقبال نے بہت زیادہ تند و تیز کر دیا ہے۔ کیا تفصیل و توضیح کے اعتبار سے اور کیا اثر انگیزی و دل نشینی کے لحاظ سے نیز انہوں نے ان باتوں کو بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کر کے سمجھانے اور دل میں اتار دینے کی بھی بڑی کامیاب کوشش کی ہے بلکہ ایک خاص امتیازی شان یہ بھی پیدا کی ہے کہ حالی کے ہاں شروع سے آخر تک یاس ہی یاس کا سماں دکھلایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اُمید کے ساز سے بھی نا اُمیدی ہی کے سُر نکلتے ہیں۔ اس کے برخلاف اقبال کے ہاں اُمید کی کرنیں پھوٹتی اور کامیابی و کامرانی کی صبح نمودار ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کی تعلیم تو یہ ہے کہ ؎

اتر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
تو اس را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ میدارے

غرض کہ اگر حالی کو تقدم کا شرف حاصل ہے اور وہ ایک ایسے معمار ہیں جس نے ایک عالیشان عمارت کا نقشہ تیار کیا ہے اور اس نقشہ پر عمارت کی بنیاد بھی رکھی ہے تو اقبال اس عمارت کو فلک الافلاک تک لے جانے والے ہی نہیں بلکہ عمارت کی آرائش و زیبائش اور اس کے نقش و نگار کی دلکشی کو چار چاند لگا کر ایسا عجیب و غریب مرقع کر دینے والے بھی ہیں کہ جس کے جمال سے نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور جس کی بلندیوں کی طرف دیکھنے والے ہتھیلی کلاہ و دستار کو سنبھالنے لگتے ہیں۔

جہاں اس مقابلے میں "اقبال اور عشقِ رسول" کے تحت جو عنوانات ضروری ہو سکتے تھے ان کو خود اقبال کی تحریرات، ان کے کلام اور پھر ان کے احباب اور عقیدت مندوں کی شہادتوں سے واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس مضمون کا مقصد محض نظریہ کو دینا نہیں ہے جیسا کہ جو اب مضمون لکھنے والوں کے پیش نظر ہوتا ہے کہ ایک دیئے ہوئے عنوان کا خاکہ بنایا اور اس میں ضروری معلومات کے ذریعہ رنگ بھر دیا اور بس اس کا منشا یہ ہے کہ ہم اس حقیقت سے واقف ہو جائیں جو ہمارا دین و ایمان ہی نہیں ہے بلکہ دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں نجات کا ضامن ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "ہم ہر چیز کو ترک کر سکتے ہیں۔ مگر عشقِ رسولِ اکرمؐ کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں دے سکتے" اس لئے کہ جب سے مسلمان اس ہما کے سایہ سے محروم ہوئے

ہیں۔ نکبت، وادیٔ ہارکی وادیوں میں سر گرداں و حیراں پھر رہے ہیں۔ حالیؔ نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کی حالت پر خون کے آنسو روتے ہوئے کہا تھا۔

نسبت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے
ایمان جسے کہتے ہیں عقبیٰ کے لیے ہار سے
وہ تیری محبت، تیری عترت کی وفا ہے

یہ اشعار آج کے مسلمانوں پر بھی اسی حد تک صادق آتے ہیں؟ اگر صادق آتے ہیں تو اس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں بھی آج یہ مسلمانوں کی حالت کیوں خراب ہے؟ حالانکہ اس وقت ان کے ... ہاتھ سے حکومت جا چکی تھی اور اب ان کو حکومت بھی مل گئی ہے۔ اور سب بھی حاصل ہو گیا ہے۔ وعدۂ خداوندی تو یہ ہے کہ "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" اور مومن کی تعریف ... حضورؐ نے یہ فرمائی ہے۔ "لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَاَهْلِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ" جو مجھے اپنے ماں باپ اور اپنی ہر چیز سے زیادہ نہ چاہے وہ مومن نہیں۔ جس کو اقبالؔ نے جوابِ شکوہ میں اس طرح ادا کیا تھا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور بعد میں بھی بے شمار موقعوں پر اسی بات کو مختلف اسلوبوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ایک ناگوار حقیقت کو بھی ناظرین کے سامنے رکھ دینا ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارا مسلک یہ رہا ہے کہ ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخوانده ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

مگر مہر و وفا ہی نے ہم کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ اس ناگوار کو بھی گوارا کریں۔ کیا مہر و وفا اس کا نام ہے کہ جس شخص کا قوم کی محبت میں یہ حال ہو، اور جو اسلام کا ایسا شیدائی ہو جس کا سرسری سا بیان اس مقالے میں ہوا ہے۔ اس کی شخصیت پر نادان دوستوں یا نادان دشمنوں کی نازیبا حرکت سے حرف آتا نظر آئے اور اس کو برداشت کر لیا جائے؟ اور کیا مہر و وفا اسی کو کہہ سکتے ہیں کہ اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے افراد نادانی یا غلط فہمی سے واقف نہ کیا جائے۔ اس غلط فہمی سے جو قوم کے لئے مضرت رساں اور خود ان کے حق میں خسر الدنیا و الآخرہ کا مصداق ہے؟ غرض کہ وہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم اقبالؔ کے بعض نام نہاد نیاز مندوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق چار قسم کے ہیں:۔

اوّل وہ نیاز مند ہیں جو اپنے خبیث طبع یا اسلام دشمن اشخاص اور اداروں کے ہاتھوں بک جانے کی وجہ سے اقبالؔ کی ذات سے اُن باتوں کو منسوب کر رہے ہیں جن کو دشمنانِ اقبالؔ بھی (اگر اقبالؔ کے دشمن ہوں) ان کے ساتھ منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان نیاز مندوں

میں پیش پیش وہ ہیں جو حدیث کے منکر ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اقبال کا نیاز مند بھی کہتے ہیں اور اپنی... قابلیت اور فلسفہ دانی کی نمائش کے لئے اقبال ہی کے کلام اور تحریرات میں عیوب و نقائص بھی نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو افکارِ مغرب کے سرقہ کا الزام دیتے ہیں، اور کبھی تہذیب و تعلیم فرنگ کی بیجا دشمنی کی تہمت لگاتے ہیں۔ اور کبھی تاریخی واقفیت، تحقیق کی کمی اور جذبات سے کام لینے کا بہتان لگاتے ہیں۔ اور اس طرح چھوٹے منہ بڑی بات کہہ کر اپنا الو بالا کرنا چاہتے ہیں۔ انہی دوسری قسم کے نیاز مندوں میں ایک صاحب ہیں جو اُن تمام اشعار کو تو نہایت ضروری اور برمحل قرار دیتے ہیں جو اقبال نے مُلّا کی مذمت میں لکھے ہیں، یہاں تک کہ ایسے تمام اشعار جمع کر کے اُن کو ایک کتاب کی شکل میں بھی شائع کر دیئے ہیں۔ مگر اُسی اقبال کے ان اشعار کو جو اُس نے تہذیب و تعلیم فرنگ کے خلاف لکھے ہیں، غیر ضروری اور بے محل بتلاتے ہیں۔ بلکہ ان اشعار میں سے ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا چُست کرتے ہیں کہ جس سے اقبال کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو، چنانچہ فرماتے ہیں "اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے۔ اور یہ مخالفت اس کی رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلّی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان

تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یوں ہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دلکش آمیزش ہے۔ لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ خیر سے لڑنے سہی لیکن یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جانا تو اچھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفّا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے بیٹھے طوفان اٹھا رہے ہیں کہ اس میں یک بیک ایک مُردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آ گئی ہے۔ ان تجربہ کے لیے۔ بالِ جبریل کی غزلوں اور نظموں سے کچھ اشعار اس قسم کے چُنے ہیں۔ اور اپنے دعوے کو مثالوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تیسرے وہ نیاز مند ہیں جو فیشن کے طور پر اقبال کی کتابوں ہی کو اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ انھوں نے اقبال کے بہت سے اشعار بھی نوکِ زبان کر لیے ہیں۔ جن کو موقع بہ موقع پڑھتے رہتے ہیں۔ مگر ان کا مطلب اپنی پستیٔ فطرت اور کجیٔ فہم کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے ہوئے اسلامی تہذیب و ثقافت کو مسخ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

چوتھے وہ نیاز مند ہیں جو اقبال کی کتابوں کی شروح لکھ رہے ہیں۔ جن کی شروع اور تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اشعار کی شرح نہیں ہوتی۔ اور ان میں نیاز مندوں نے جا بجا اپنے آپ کو اقبال کا شاگرد بھی کہا ہے اور بعض ان کتابوں کا اقبال سے سبقاً سبقاً پڑھنا بھی ظاہر کیا ہے جن کی شرح کر چکے ہیں۔ ان شارحین میں سے ایک

صاحب نے یہ غضب کیا ہے کہ کسی شعر شرح بھی تصنگ سے نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شرح میں اقبال کو اچھا خاصا خالص ہی صوفی بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں کہیں لفظ عشق آیا ہے۔ اس کو پیر کے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ نظر لفظ کو پیر کی توجہ اور تصور کو پیر کے تصور سے اور اسی طرح جتنے ایسے الفاظ آئے ہیں ان کو تصوف ہی کی اصطلاحوں کے ساتھ منسوب کرتے چلے گئے ہیں۔ اور ایسے ہر شعر کی شرح کرنے سے پہلے یہ فقرہ بھی لکھتے رہے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر تصوف کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔ وہ تو خیر سے ان حضرت نے اقبال کا کوئی خاص پیر فرض نہیں کیا ورنہ ہر شعر میں اس کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر اپنے فلاں پیر کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔ ایک دوسرے شارح صاحب نے اقبال کے کلام کا مطلب اس قدر اختصار کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان کے نزدیک اختصار ہی میں شعر بھی ہو جاتی ہے۔ اور اختصار ہی میں شعر کی تمام خوبیاں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اختصار کا دامن کہیں نہیں چھوڑا ہے، خواہ مطالب اشعار کا دامن ہزار جگہ چھوٹتا رہا ہو۔ ان مطالب اشعار سے نہ ایک طالب علم مستفید ہو سکتا ہے نہ ایک ناظر کتاب۔

چوتھا قسم کے نیاز مندوں میں، قوم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے وہ نیاز مند ہیں جنھوں نے انکار حدیث کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے۔ کیسا زبردست تضاد ہے اقبال اور ان اقبال کے افکار و اعمال کے درمیان! کہ وہ اقبال جو عشق رسول میں شیرۂ آفاق، جو سنت رسول کا بھی ایسا ہی والہ و شیدا جیسا کہ کتاب اللہ کا، جو قرآن کریم کا مفسر تھا تو حدیث کا شارح بھی تھا بلکہ بقول "مولانا مودودی" حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان

کھڑے کرتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی، اور کے ٹیڈ الفنی مفہوم ہیرا بیان رکھتا تھا۔ اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتماد رکھنا اُن کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں اُن کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے، اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔" اس اقبال کے بنیاز مند اور شاگرد حدیث سے جس انکار کر رہے ہیں۔ اور اسلام کی تہذیب، کلچر اور روایات سے بھی!

کاش یہ منکرین حدیث اندکوزۂ صدر بیان کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں تاکہ ان کو اپنے چہرے کی سیاہی نظر آجائے! مگر اصلاح منظور کس کو ہے! بلکہ جس طرح ایک شخص اپنے وقت کی حکومت کے ہاتھوں بک کر دعوائے نبوت کر دیتا ہے۔ اور ملت اسلامیہ کے لئے ایسا عظیم فتنہ کھڑا کر جاتا ہے جس کی خرابیوں سے مسلمان قیامت تک نبٹتے رہیں گے اور دشمنانِ اسلام خوش ہوتے رہیں گے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی ایسی ہی مادی وجاہتوں اور ذاتی فائدوں کی خاطر انکارِ حدیث کے ذریعہ قوم میں انتشار پھیلانا اپنا فرضِ منصبی سمجھ لیں تو کونسی تعجب کی بات ہے! اور قرآنِ کریم کے ماننے کا تو ایک فریب ہے جو سادہ لوح عوام کے لئے گھڑا گیا ہے۔ ورنہ کوئی ان مکاروں سے یہ پوچھے کہ وہ قرآنِ کریم کے ماکیونکر مانتے ہیں۔ آخر اس کے لئے بھی تو اُن کے پاس تواتر کے سوا اور کوئی سند نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کے ماننے کا دعویٰ اور حدیث سے انکار ہے

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

کیا دُنیا میں سب بیوقوف ہی بستے ہیں۔ کیا یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اسلام دشمن لوگ اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت دینے والی چیز تو سنّت اور صرف سنّت ہی ہے۔ سنّت کو درمیان سے ہٹا دینے کے بعد دین کی کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ "سنّت درحقیقت اُن اصولوں کا ایک فرضی مقتضیٰ ہے جو قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر سنت کو سامنے سے ہٹا دیجئے تو قرآنِ کریم ایک بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اور ہر مسخرا اس کی آیتوں کو اغراض و اہوا کی وادیوں میں گھسیٹتا پھرے گا۔ قرآنِ کریم کے اصولوں پر سنّت کے سوا کوئی اور خول چڑھانا قرآنِ کریم کے سارے اصولوں کو غارت کر کے رکھ دینا ہے۔ اس قامت پر صرف سنّت ہی کا جامہ راست آسکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور جامہ اس کو پہنانے کی کوشش کی گئی تو اس کا سارا حلیہ ہی مسخ ہو کر رہ جائے گا"[1]

لہٰذا انکارِ حدیث کو انکارِ قرآن کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے کہ انکارِ قرآنِ کریم حدیث کے انکار کا ایسا لازمی و منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی بھی صاحبِ عقل و رائے انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ انکارِ قرآنِ کریم معاً تو شروع بھی ہو گیا ہے اس لئے کہ قرآنِ کریم کی ایسی الٹی سیدھی تفسیریں کی جا رہی ہیں کہ آج تک کسی نے دیکھی نہ سنیں۔ اور وہی طریقۂ تاویل کام میں لایا جا رہا ہے۔ جو اس ملک کے کاذب نبی نے اختیار کیا تھا اور جس کو اُس کی اُمّت کے مفسدوں نے ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے قرآنِ

---

[1] رسالہ ترجمان القرآن بابت صفر ۱۳۷۵ھ صفحہ ۵۸

کریم کو اپنے مذموم عزائم اور ناپاک نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ اور یہ تفسیر بالرائے کتنے بھی زیادہ خطرناک اقدام ہے۔ اگرچہ ہمارا یقین ہے کہ جب قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے تو یہ دشمنانِ اسلام قرآن و حدیث سے انکار کر کے کبھی نہ قرآن کریم کو مٹا سکیں گے نہ حدیث کو۔ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے ایسے فتنے کھڑے کر کے اسلام کے آفتاب کو گرد و غبار میں چھپا دینے کی ناپاک کوششیں کی گئی ہیں، اسلام کی درخشانی و تابانی میں اور ترقی ہوئی ہے ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مگر قوم میں ایک وقتی انتشار ضرور پھیلتا ہے اور دوسری اقوام کو ان نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ہتھیار ملتے ہیں جن سے وہ اسلام پر وار کرتے ہیں۔ اور مسلمان اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو قوم کی ترقی و تعمیر اور نشر و اشاعت میں صرف کرنے کی بجائے ان دشمنوں سے نبرد آزما ہونے میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ قومی نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی ہو رہا ہے کہ ایک طرف مرزائیت اپنے پورے مادی وسائل کے زور سے اسلام کی تخریب کر رہی ہے تو دوسری طرف ثقافتِ اسلام کے نام پر ہر قسم کی خلافت اسلام پر ڈالی جا رہی ہے۔ اور تیسری طرف منکرینِ حدیث بھانت بھانت کی بولیوں سے مسلمانوں کے دماغ میں الجھن اور دلوں میں وسوسے پیدا کر رہے ہیں۔ اور چوتھی سمت پر وہ مغرب زدہ گروہ ہے۔ جو یہاں تک مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے کہ جو بات اہلِ مغرب کہیں وہی ان کے نزدیک درست اور قابلِ قبول ہے۔ اس طرح اسلام چاروں طرف سے نرغے میں آیا ہوا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ یہ چاروں گروہ ایک ہی لشکر کے چار حصے ہیں جو اسلام پر چار طرف سے حملہ آور ہونے کے لیے تقسیم ہو گئے ہیں۔ اور شدّتِ عداوت کے ساتھ حملہ کر رہے ہیں کہ اس عداوت میں اور سب کی سنتے ہیں مگر نہیں سنتے تو اسلام کی نہیں سنتے خواہ وہ قرآنِ کریم کی زبان سے دہائی دے خواہ حدیث کی زبان سے اور خواہ جانشینانِ رسولؐ (علماء و صلحاء امّت) کی زبان سے۔

بہر حال مقالے کو اسی تلخ نوائی پر ختم ہونا تھا۔ مگر ہم اس سے خوش ہیں اس لئے کہ اقبال پسند حضرات کو ایک لمحہ فکر یہ کا موقع دے سکتی ہے اور اگر انہوں نے ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا تو ان نیاز مندوں کو ان کی اصلی صورت دیکھ کر خود بھی ان کے دامِ فریب سے بچیں گے اور دوسروں کو بھی بچانے کی تدبیر کر سکیں گے۔ کہ یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہے۔ آخر میں ہم مولانا عبد الماجد دریا بادی کی وہ ہدایت نقل کر کے مقالے کو ختم کرتے ہیں۔ جو انہوں نے اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال پسندوں کے لیے ارشاد فرمائی ہے:۔

"اقبال اور جوہر (مولانا محمد علی مرحوم) کا رنگ عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا۔ لیکن نظر سطح سے گذر کر تہہ تک پہنچے اور محض عمل نہیں محرّکاتِ عمل سامنے ہوں تو ہر دیکھنے والا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا، سرشت ایک، طینت ایک، قالب دو، روح ایک، حبِّ اسلام کے جنون میں دونوں گرفتار، عشقِ رسولؐ اسلام کے جام سے دونوں سرشار، ایک کی سیاست دوسرے کی شاعری دونوں

اُسی رنگ سے رنگین۔ فرق اتنا کہ ایک کے کلام میں حکیمانہ ذوقِ عرفان دوسرے کے قلم و زبان میں جوشِ طوفان، دونوں دُنیا میں جیئے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے پڑھتے ہوئے دونوں دُنیا سے اُٹھے تو "آبروئے نامِ مصطفےٰؐ" کا وظیفہ جپتے ہوئے! ایک نے چہرے پر سیاست کا نقاب دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب، حقیقتاً نہ یہ شاعر نہ وہ سیاسی لیڈر۔ خدا آپ حضرات کو توفیق دے کہ آپ اقبالؔ کے اصل مقام کو پہچانیں اور کلام کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر اس کے وسطی اور آخری حصّوں کو پڑھ کر اس کی رُوح اور مغز تک پہنچیں۔

ختم شد

ہماری معیاری مطبوعات

قرآن مجید مترجم ع۸۱ مترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ہدیہ مجلد ریگزین -/۳۲

قرآن مجید معری ع۳ بہترین چکنا کاغذ عمدہ جلد ہدیہ مجلد ریگزین -/۲۵

بال جبریل مع شرح "پروفیسر یوسف سلیم چشتی صفحات ۸۱۶ قیمت -/۳۲

صحیح بخاری شریف مترجم مصنف ابو عبداللہ مترجم مولانا عبدالحکیم خان ہدیہ کامل -/۲۵۰

جامع الترمذی مترجم عکسی از تالیف مولانا بدیع الزماں قیمت کامل -/۱۵۰

سید الانبیاء ترجمہ الوفا مصنفہ امام عبدالرحمٰن ابن جوزی مترجمہ محمد اشرف سیالوی قیمت -/۷۵

جدید عصری لغت (باتصویر) قیمت -/۲۱

جیبی تعلیم اللغات اُردو (باتصویر) " -/۷۵۰

تعلیمی عربی اُردو، اُردو عربی لغات " -/۱۵

جیم پاکٹ ڈکشنری اُردو۔ انگلش " -/۷۵۰

" " انگلش اُردو " -/۷۵۰

کنسائز ڈکشنری انگریزی اُردو " -/۱۵

ڈکشنری اُردو انگریزی " -/۳۵

" انگریزی اُردو " -/۳۵

کنسائز۔ انگلش ان ٹو انگلش اور اُردو ڈکشنری قیمت -/۲۰

اسٹینڈرڈ۔ انگلش سے انگلش اور اُردو ڈکشنری " -/۹۰

داستان ایمان فروشوں کی (مکمل تاریخ اسلام) التمش، قیمت کا ۲ سٹ پانچ حصص -/۱۳۰